شعبان ۱۳۵۶ھ
جلد (۱۱) عدد (۲)

رجسٹرڈ نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹرڈ نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی۔ اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کر کے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آ گئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت [illegible] جلد [illegible] انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت [illegible] انگریزی [illegible] سکہ عثمانیہ)

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ شعبان ۱۳۵۶ھ - جلد ۱۱ - عدد - ۲ -

تصحیح

جمادی الاخریٰ کے پرچہ میں صفحہ ۱۰۴ پر دوسری سطر میں یہ الفاظ چھپ گئے ہیں :- "پیش نظر سورہ ہی میں یہودیوں پر یوں نیش زنی کی گئی ہے" یہاں لفظ نیش زنی کے بجائے نشتر زنی پڑھا جائے۔ نیش زنی میں سوء ادب کا پہلو ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ سہواً یہ الفاظ پرچہ میں شایع ہو گئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ہم اپنے ناظرین کو خاص طور پر ڈاکٹر سید عبد اللطیف صاحب کے اس سنجیدہ اور مفکرانہ خطبہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو اس اشاعت میں بعنوان "ہندوستان میں اسلامی تہذیب"، درج کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطبہ میں چھوٹے چھوٹے جزئی مسائل کو چھوڑ کر اُس اصل مسئلہ کو سمجھانے کی کوشش کی ہے جو اس وقت ہندوستان میں مسلم قوم کو درپیش ہے، اور فی الواقع اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ فروعات سے الگ کر کے اس مسئلہ کو واضح اور منقح صورت میں پیش کیا جائے، تاکہ ہم اپنے اہل ملک کو غلط فہمی سے، اور خود اپنی قوم کو دھوکا کھانے سے بچا سکیں۔

مسلمانوں کے صاحب علم اور صاحب فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نااہل اور ناقابل اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے، اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کر کے دوسروں ہی کو نہیں خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کے لیے فی الواقع کونسا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے محض چند سطحی اور

حقیر سے جزئیات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اور ان پر مناسب حد سے بہت زیادہ زور دیکر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے، کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے جن کو محض جہالت تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے، انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے، تاکہ مسلمان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکار برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کی مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہو گئی ہے اور مخالف گروہ کے لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، یہ تو محض امپیریلسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے، اور صرف ٹوڈیوں، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہو جاتے رہے ہیں کہ درحقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادیٔ وطن کے مسئلے سے بڑھ کر ہم کو اس کی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان و قلم پر تھیں — یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے یہ جادو عوام سے گذر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن کا اصلی فرض یہ تھا کہ جانشینان رسول ہونے کی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے، اور جانشینان رسول ہونے کی حیثیت ہی سے اس کو حل کرنے کی کوشش

کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند ارباب فکر جو حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی بھی اصلیت رکھتے ہیں اور جن کا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے، مہر خاموشی نہ توڑیں گے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کریں گے، تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گزرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم قریب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپ کو بڑے خطرے میں ڈالنا ہے کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سننی پڑیں گی اور انسان کے لیے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دلشکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جن کی بھلائی کے لیے وہ کام کرتا ہے، لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی ذات کے مفاد سے بڑھ کر اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انھیں ہر بُرے سے بُرے نتیجہ کو برداشت کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے، اور کم از کم تذکیر کا فرض بجا لانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہیے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھ کر ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے، اور ان کے جذبات و داعیات کا صحیح حال جاننے والے، اور ان کے قلب و روح کی سچی نمائندگی کرنے والے ہو سکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر علاج تجویز کریں گے، آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رو میں بہتے جا رہے ہیں، اور نادانستہ انکی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے ہوئے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولنا سید سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے ــــ مولنا کے علم و فضل اور صداقت، ان کے تفکر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ سے تھا ویسا ہی آج بھی ہوں، اور خاص طور پر ان کی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا ان کی ذات گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے، بلکہ

دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحب فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے ــــ مولانا فرماتے ہیں۔

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو وہ اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں۔ یا یہ کریں کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوت بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مال غنیمت پر قبضہ کرتی ہے اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مال غنیمت میں جھگڑا کریں۔ یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی کے لیے ان کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ کریں اور اپنے لیے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں (" انصاری" مورخہ ۳ رمضان ۱۳۵۶ھ)۔

غور کیجیے! یہ ارشاد گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے؟ "مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے ہوئے کھڑے ہیں، اس کی وجہ کچھ اور نہیں، محض بزدلی ہے۔ اور یہ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی ــــ جو ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں ــــ شیروں کی طرح شکار ماریں گے تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آ کر حصہ لڑانے کی کوشش کرے گی" ــــ یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے۔ اس کے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیران بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کے لیے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پھر یہ "جنگ آزادی" کس قدر پاک کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے کہ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں، ایسی پاک جنگ ایسے مقدس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا، اب

بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دوں ہمت اور کمینے ہیں!

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے۔ اور جب کوئی قوم نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں، اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں۔ جو تصویر اپنی اغراض کے لیے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جارہی ہے اور اس کو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولٰنا نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ فضا جن خیالات سے بھر دی گئی ہے، وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کر رہے ہیں اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آرہے ہیں۔ یہ ایک جادو ہے جو سروں پر چڑھ کے بول رہا ہے، اور کیا بتائیے کہ کیسے کیسے عالی مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے۔ "فرقہ پرستی" کا لفظ جو مغربی تصور قومیت کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا تھا، آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں۔ "نیشنلزم" یا "قوم پرستی" کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جارہا ہے۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان ایک "قوم" ہے، اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے فرقے ہیں۔ "رجعت پسندی" اور "ٹوڈیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کیے جانے لگے ہیں، اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہاد مقدس میں کود پڑنے سے احتراز، بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ٹوڈیت ہے، یا پھر بزدلی۔

اس طوفان کے شور و ہنگامہ سے دماغ اس درجہ متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کے ساتھ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر، عالی حوصلہ، حریت پسند

اور جنگ آزما قوم کو برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایانِ شان حصہ لینے سے روک رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے اتنے طعنے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سنتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی کہ شائد یہ مسلمانوں کا قصور ہو، تو اس کی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ شائد اس "جنگ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو، شائد یہ "شیرانِ بیشۂ حریت" اس جنس کے شیر نہ ہوں جن سے "اسد اللہ" میل کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے، شائد اس "آزادی کی فوج" میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھ کر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کر رہا ہو کہ ان کے ساتھ چلکر میں اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکوں گا ـــ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے۔ پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی قہرمانی نہیں تو اور کیا ہے جس کی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان جزم و یقین بن کر مسلط ہوتا جا رہا ہے، اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور کھویوں میں سے کسی کو بھی یہ یاد نہیں آتا کہ اس کا بھی کوئی امکان ہے۔

آج میں بہت ہی صاف صاف الفاظ میں ان حضرات کو دوسرا پہلو دکھانا چاہتا ہوں۔

جس جنگ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے
جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہ حق پر گامزن ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جا رہی ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونے کے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اس کے ساتھ نہیں چل سکتی
جس طریقہ کار کو وہ بالکل صحیح طریقہ کار سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریق کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنے کے بعد میں ان سے درخواست کروں گا کہ اس کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں، انصاف کی نظر سے دیکھیں اور اس نور علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ آیا وہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں یا نہیں

اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے تو انھیں بلالحاظ اس کے کہ غلط راستہ پر کتنی دور جا چکے ہیں، لَوٹنے قدم واپس ہونا چاہیے اور راہ راست معلوم کرنے کے لیے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں، تو میں ان سے مطالبہ کروں گا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں۔ بعض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گذشتہ موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا، یا نرے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے اور نہ اس سے اِحقاق حق یا ابطال باطل ہوا کرتا ہے۔ براہ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آئیے۔ جو حقائق ہم پیش کر رہے ہیں، یا تو یہ ثابت کر دیجیے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کرکے دلیل و حجت سے — حجت خواہ عقلی ہو، یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت — ثابت کیجیے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے۔

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اُس احساس ذمہ داری سے ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو اپنے ہر عمل کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ پھر اس کا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابل ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے، جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں۔ جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں بھی شامل نہیں اور اس نے آج تک خدا کی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کی طرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے۔ لہٰذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہہ دینا چاہتا ہوں میرا خطاب ائمۂ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ خود اماموں سے ہے۔ ان مقتدیوں سے میں کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش

نہیں کرتے، اور بس اول نظر میں یہ دیکھ کر کہ کہنے والا کچھ ان کی ہوائے نفس کے خلاف کہہ رہا ہے، جوابی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

مسلمانوں میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کے لیے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہوگی، بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں لیکن جمہور مسلمین میں شائد کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہ ملیگا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ مسلمانوں کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ تمام دوسری قوموں کی بہ نسبت انگریزی اقتدار کو بہت زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کا تو مذہب ہی انہیں یہ سکھاتا ہے کہ ظلم و جور کی حکومت سے نفرت کریں۔ پھر ان کے دلوں میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس ملک کی حکومت انہی سے چھینی گئی تھی اور انہی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا۔ اس لیے نہ صرف فطرۃً بلکہ تاریخی اسباب کی بنا پر بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادی کے خواہشمند ہیں۔

لیکن آزادی وطن کوئی پری نہیں ہے کہ ہر شخص بے اختیار اس کے عشق میں مبتلا ہو جائے اور جس رنگ میں بھی وہ جامہ پوش ہو، اس کے انداز قد پر فریفتہ ہی ہو کر رہے۔ کسی غیر ملک کا غلام نہ رہنا آزادی کا ایک شعبہ ہے، تمام آزادی نہیں ہے کہ محض اسی کے متحقق ہو جانے سے وطن کے ہر طبقہ کو وہ تمام فوائد حاصل ہو جائیں جن کے لیے اس کو آزادی مطلوب ہے۔ غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو نیکا جہاں تک تعلق ہے، امریکہ ایک آزاد ملک ہے، مگر کیا امریکہ کے حبشیوں کو بھی کوئی آزادی حاصل ہے؟ جیکوسلوواکیا آزاد ہے مگر کیا وہاں کی جرمن آبادی کو بھی کوئی آزادی حاصل ہے؟ روس آزاد ہے مگر کیا وہاں کے مسلمانوں اور عیسائیوں کو بھی کوئی آزادی حاصل ہے؟ جنوبی افریقہ آزاد ہے مگر کیا وہاں کی دیسی اور ہندوستانی آبادی کو بھی کوئی آزادی حاصل ہے؟ ہندوستان کی بھی

کبھی آزاد تھا، مگر کیا یہاں کے قدیم غیر آریہ باشندوں کو بھی کوئی آزادی حاصل تھی؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان آزاد ممالک میں مظلوم قوموں پر خود ان کے اہل وطن نے وہ ظلم کیے ہیں اور کر رہے ہیں، جن کے مقابلہ میں غلام ممالک کے باشندوں پر غیر ملکی حاکموں کا ظلم و جور بھی گرد ہے؟

پس جب حال یہ ہے تو محض "آزادیِ وطن" کا نام لیکر یہ توقع کرنا کہ مسلمان اس جادو بھرے نام کو سن کر "شیر و شکر می شود جانم تمام" کہتے ہوئے دیوانہ وار دوڑ پڑیں گے اور "آزادی کی فوج" کا شاندار نام لے کر یہ امید رکھنا کہ مسلمان ان کو غزاۃ و مجاہدین فی سبیل اللہ کی سی مقدس جماعت سمجھ کر خالص ایمانی جذبہ کے ساتھ ان کی صفوں میں آن شامل ہوں گے، سراسر خام خیالی ہے۔ اور اگر مسلمان اس توقع بیجا اور امید غلط کو پورا کرنے سے قاصر رہیں تو ان کو ملعون کرنا، خام خیالی سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ نرم سے نرم الفاظ میں ہم اس کو ظلم کہیں گے اور کلام ملا فکر کی ایک بہت بری مثال قرار دیں گے۔

مسلمان یہ پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ "یہ آزادی کی فوج" جس چیز کے لیے جنگ کر رہی ہے وہ میری قومی اغراض کے لیے بھی مفید ہے یا نہیں۔ اگر اس کو آثار سے، قرائن سے، کھلی ہوئی علامتوں سے خود اس فوج کے سپہ سالاروں کی زبان و قلم سے معلوم ہو جائے کہ اُن کی منزلِ مقصود مسلمان کی منزلِ مقصود سے بُعد المشرقین رکھتی ہے تو مسلمان اس فوج سے کنارہ کش ہو جانے میں بالکل حق بجانب ہوگا۔ اس کنارہ کشی کو غلط معنی پہنانا اور اس کو ٹوڈیت، رجعت پسندی، انگریزی اقتدار کی حمایت اور "فرقہ پرستی" سے تعبیر کرنا محض ظلم ہی نہیں بے عقلی بھی ہے۔ آخر کونسی معقول وجہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان ایسی لڑائی میں اپنی جان و مال قربان کرے جو اسلامی اغراض کے لیے مفید نہ ہو؟ اگر یہ ٹوڈیت ہے تو غالباً یہ لفظ اب فراستِ ایمانی کا ہم معنی ہو گیا ہوگا۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں دو شبہات کا جواب عرض کر دوں۔

کہا جاتا ہے کہ جبرالٹر سے لیکر عدن اور بصرہ تک اسلامی ملکوں اور قوموں پر انگریزی استعمار کا جال صرف ہندوستان کی خاطر پھیلایا گیا ہے جتنے مظالم بیرون ہند کی مسلمان قوموں پر ہوئے ہیں ان سب کی وجہ ہندوستان ہی ہے اسلئے ہندوستان کی آزادی کا سوال دنیا کے چالیس کروڑ مسلمانوں کی آزادی کا سوال ہے اور اگر اس سوال کے حل کرنے میں ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان پامال بھی ہو جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ لہذا مسلمانوں کو اس وقت یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ اس جنگ آزادی کے نتائج خود ان پر کیا مرتب ہونگے بلکہ انھیں تمام نتائج سے بے پروا ہو کر بس جنگ میں کود پڑنا چاہیئے تاکہ کسی طرح انگریزی سلطنت کا خاتمہ ہو اور ممالک اسلامیہ آزاد ہو جائیں۔

یہ بات عام طور پر سیدھے سادھے مسلمانوں کو پرچانے کے لیے کہی جایا کرتی تھی اور چونکہ وہاں بہت کچھ کارگر ثابت ہوئی اس لیے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اسے ایک بہت ہی وزنی دلیل اور بڑی کانٹے کی سیاسی بات سمجھ کر سنجیدہ مباحث میں بھی پیش کیا جانے لگا ہے، حالانکہ درحقیقت یہ بھی اسی خام خیالی کا ایک کرشمہ ہے۔ تدبر کا حصہ اس میں بہت کم ہے۔ تحریک وطن پرستی جس کو آپ "جنگ آزادی" فرما رہے ہیں، اگر کامیاب ہو جائے، اور اس کے نتیجہ میں انگریزی امپیریلزم کا خاتمہ ہو جائے تو بلاشبہہ ممالک اسلامیہ انگریزوں کے جال سے نکل جائیں گے، مگر اس امر کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ ہندوستان کی آئندہ سلطنت، برٹش امپائر کی جانشین نہ بن جائیگی۔ کوئی معقول وجہ یقین کرنے کی نہیں ہے کہ وزیرستان پر ایسی ہی وحشیانہ گولہ باریاں نہ ہونگی، افغانستان کی ترقی میں اسی طرح رکاوٹیں نہ ڈالی جائیں گی، ہندوستان کی بحری مدافعت کا بہانہ لیکر اسی طرح ان راستوں پر تسلط جمانے کی کوشش نہ کی جائے گی جن سے ہندوستان پر حملہ ہو سکتا ہے اور تاریخ کے دوران میں ہو چکا ہے۔ یہ وہی امپیریلسٹ پالیسی ایک دوسری شکل میں ہوگی۔ پھر آپ کو خبر ہے کہ تحریک وطن پرستی کی کامیابی کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان کا دل اندر سے بدل جائے اس کو اپنے برادران دینی کے مفاد سے بڑھ کر اپنے وطن کا مفاد عزیز ہو، اور وہ خود اس ہندوستانی امپیریلزم کا دل و جان سے حامی ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ محمد علی جیسا سچا مسلمان جب وطن پرستی کے اثرات سے ذرا متاثر ہو گیا تھا تو اس نے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ اگر باہر سے کوئی مسلم قوم ہندوستان

میں خالص اسلامی شرعی حکومت قائم کرنے کے لیے بھی حملہ کرے تو میں اس سے لڑوں گا۔ یہ وطن پرستی کا ایک ذرا سا غبار لگ جانے کا اثر تھا، اگر یہ رنگ گہرا چڑھ جائے تو ایک شخص جس کا نام عبداللہ یا عبدالرحمن ہوگا، وطنی اغراض کی خاطر اللہ کے گھر پر گولہ باری کرنے میں اس سے زیادہ دلیری دکھائیگا جو اس کے پیش رو نے انگریزی اغراض کی خاطر دکھائی تھی، اس لیے کہ انگریز کی غلامی کرنے والے مسلمان کا دل نہیں بدلا تھا۔ پیٹ اس کو لڑنے کے لیے لے گیا تھا اور دل اسکا اندر سے ملامت کر رہا تھا۔ مگر وطن پرست مسلمان کے اندر وہ ملامت کرنے والا ضمیر ہی باقی نہ رہے گا۔ وہ اعتقاد کی قوت کے ساتھ اس کام کو انجام دیگا

پس وطن پرستانہ جنگ آزادی ممالک اسلامیہ کے لیے بھی کسی طرح مفید نہیں ہے۔ آٹھ کروڑ ہندی مسلمانوں کی طرح بتیس کروڑ غیر ہندی مسلمانوں کی بھلائی کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اندھوں کی طرح ہر اس جنگ میں نہ کود پڑیں جس کا نام "جنگ آزادی" ہو، اور نہ دیوانوں کی طرح ہر اس فوج کے ساتھ لگ چلیں جس کا نام "آزادی کی فوج" ہو، بلکہ ہوشمندی کے ساتھ یہ دیکھیں کہ یہ فوج جس چیز کے لیے لڑ رہی ہے وہ ہماری قومی اغراض کے مطابق ہے یا نہیں۔

ایک اور بات جو تقریر یا تحریر میں نہیں بلکہ پرائیویٹ صحبتوں میں صرف مسلمانوں کو سنائی جاتی ہے اور بہت سے مسلمان اس سے دھوکہ کھا جاتے ہیں، یہ ہے کہ اس وقت جنگ جیسی کچھ بھی ہے اور جس طرح بھی ہو رہی ہے ہونے دو، بعد میں ہم اور ہندو آپس میں نمٹ لیں گے — یہ کہنے کے بعد مسلمانوں کو اس حیات بعد التحریت میں فتح و ظفر کے امکانات بڑے امید افزا طریقہ سے سنائے جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ مشرک ہندوؤں میں اتنا بل بوتا کہاں کہ توحید پرست مسلمانوں کے مقابلہ میں ٹھیر سکیں، میدان بہرحال تمہارے ہی ہاتھ ہے۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ تمہاری پشت پر خیبر سے لے کر مراکش تک کے مسلمان ہیں، بھلا وہ تمہیں شکست کھانے دیں گے؟ یہ اور ایسی ہی خدا جانے کتنی فضولیات بیان کی جاتی ہیں جن کو سن کر بیچارے سادہ لوح مسلمان تو "جنگ آزادی" کے فریب میں

مبتلا ہو جاتے ہیں، مگر جن کو خدا نے کچھ بصیرت عطا فرمائی ہے اور جو ہندوستان کے موجودہ حالات سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں، وہ غریب اس سوچ میں پڑ جاتے ہیں کہ جس قوم کی سیاسی پالیسی ایسی خام خیالیوں اور طفل تسلیوں پر مبنی ہو جائے اس کا کیا حشر ہوگا؟

اس غلط خیال کی اصلاح کے لیے صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہندوستان کی یہ جنگ آزادی کسی خونریز انقلابی تحریک کی شکل میں نہیں ہے، بلکہ ایک تدریجی دستوری انقلاب کی شکل میں ہے اسلیے یہ تخیل ہی سراسر لغو ہے کہ انگریزی سلطنت کا خاتمہ ہونے کے بعد آپ کو آپس میں نمٹنے کا کوئی موقع ملیگا۔ خونریز انقلابی تحریک کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ کامیاب ہوتی ہے تو یکایک قصر سلطنت مسمار ہو جاتا ہے، تمام ملک میں انارکی اور بے نظمی پھیل جاتی ہے، اور پھر نئے سرے سے ایک نظام حکومت وجود میں آنا شروع ہوتا ہے۔ ایسی صورت اگر ہو تو بلا شبہ یہ کہنا معقول ہے کہ پہلے اس قصر کو گرا لو، پھر دوسرا قصر بناتے وقت قوت آزمائی کر لیں گے، جو غالب رہے گا اسی کی مرضی کے مطابق قصر تعمیر ہوگا۔ لیکن یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ پرامن انقلابی تحریک کے دباؤ سے پرانا قصر آہستہ آہستہ منہدم ہو رہا ہے اور نیا قصر آہستہ آہستہ منہدم شدہ بنیادوں پر اٹھتا جا رہا ہے حتیٰ کہ پرانے قصر کا انہدام جس وقت مکمل ہوگا اسی وقت نئے قصر کی تعمیر بھی آپ سے آپ مکمل ہو جائے گی۔ اس امر میں اگر پہلے کسی شبہ کی گنجائش بھی تھی تو وہ اب نہیں رہی، کیونکہ "آزادی کی فوج" نے جدید اصلاحی دستور کے تحت وزارتیں مرتب کر لی ہیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ تدریجی دستوری انقلاب چاہتی ہے، نہ کہ ایسا انقلاب جس میں موجودہ حکومت کے کامل انہدام تک بالکلیہ عدم تعاون کیا جائے اور جب وہ منہدم ہو چکے اس وقت اپنی مرضی کے مطابق نیا نظام حکومت قائم کیا جائے۔ پس جب صورت حال یہ ہے تو بعد میں نمٹنے کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ کو نمٹنا ہے تو اسی "جنگ آزادی" کے دوران میں نمٹنا چاہیے اور آخر تک نمٹتے رہنے کے لیے ہر وقت مستعد رہنا چاہیے۔ ورنہ اگر آپ اسی خیال خام

میں نمٹنے کے سوال کو "بعد" کے لیے ملتوی کرتے رہے، تو وہ "بعد" کبھی آئے گا ہی نہیں جب آپ کو نمٹنے کا موقع ملے گا۔ حکومت کے اندر ایک حکومت آہستہ آہستہ بنتی رہے گی۔ ایک دارالکفر کی جڑ سے دوسرا دارالکفر آہستہ آہستہ پیدا ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ پرانے دارالکفر کے ختم ہوتے ہی نئے دارالکفر کی گرفت اسی طرح ہندوستان پر قائم ہو جائے گی جس طرح پرانے دارالکفر کی تھی، پھر اس کی شکل بدلنا اتنا ہی مشکل ہوگا جتنا آج اس دارالکفر کی شکل بدلنا مشکل ہو رہا ہے۔

اب آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ "آزادی کی فوج" میں بلا تامل شرکت کا مشورہ کیسے غلط اور بے اصل دلائل پر مبنی ہے۔

اس کے بعد ہم پھر اسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کوئی لشکر آزادی، مجرد لشکر آزادی ہونے کی بنا پر ہرگز اس کا مستحق نہیں ہے کہ مسلمان پر اس کی شرکت فرض ہو جائے۔ مسلمان کو یہ حق پہنچتا ہے، بلکہ عقل و دین دونوں کی طرف سے اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وطن کے مجموعی مفاد اور اپنے قومی مفاد پر یکساں نظر رکھے، اور کسی لشکر آزادی کے ساتھ تعاون کرنے سے پہلے یہ دیکھ لے کہ جس آزادی کے لیے وہ جنگ کر رہا ہے اس میں مسلمان کے لیے بھی آزادی ہے یا نہیں۔

مسلمان کی آزادی، اسلامی اغراض، قومی مفاد، یہ مبہم الفاظ جو میں استعمال کر رہا ہوں، ان کی تشریح اس سے پہلے ان صفحات میں کر چکا ہوں، مگر آگے جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کی تفہیم کے لیے ضرورت ہے کہ یہاں پھر صاف اور صریح الفاظ میں بیان کر دیا جائے کہ ان الفاظ سے کیا مراد ہے۔

مسلمان کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو اس نقصان کی تلافی کا موقع مل جائے جو انگریزی حکومت کے تسلط سے ان کی تہذیب اور قومیت کو پہنچا ہے۔ آزاد ہندوستان کی حکومت میں مسلمانوں کو اتنا اقتدار حاصل ہو کہ وہ خالص اسلامی اصولوں پر اپنے نظام اجتماعی کو از سر نو مرتب کر سکیں، قوانین شرعی کو اپنی قوم کے افراد پر نافذ کر سکیں، اپنی جماعت میں احکام اسلامی سے

انحراف اور غیر اسلامی خیالات اور طریقوں کی اشاعت کو روک سکیں، تعلیم کے اس نظام سے جو سراسر مخالفِ اسلام ہے، اور جس کی بدولت مسلمانوں کو بتدریج و باقساط مرتد بنایا جارہا ہے، نجات حاصل کرسکیں اور اپنے اصولوں کے مطابق اپنی قوم کی تعلیم کا انتظام کرسکیں۔

مسلمان کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے نظام حکومت میں دوسری قوموں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی اپنا اختیار تمیزی استعمال کرنے کا پورا موقع حاصل ہو تاکہ خارجی یا داخلی معاملات میں، قانون سازی اور اس کے نفاذ میں، نظم مملکت اور اس کے مختلف شعبوں میں، ہندوستان کی حکومت کبھی کوئی ایسی پالیسی اور طریق کار اختیار نہ کرسکے جو مسلم قوم کے اصولِ تہذیب کے خلاف ہو، یا جس سے مسلمانوں کو من حیث القوم نقصان پہنچتا ہو، یا جس سے بیرون ہند کی کسی مسلم قوم کا مفاد متأثر ہوتا ہو۔

مسلمان کی آزادی سے مراد یہ ہے کہ آزاد ہندوستان کے باشندوں کو ترقی کے جتنے وسائل حاصل ہوں ان سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان بھی سب کیساتھ برابر کا شریک ہو، اور کوئی طاقت اس کے ساتھ امتیازی سلوک کرنے کی جرأت نہ کرسکے۔

یہ کم سے کم مرتبہ ہے آزادی مسلم کا۔ مسلمان آزادی وطن کا خواہشمند صرف اسی لیے ہے اور اسی لیے ہوسکتا ہے کہ وطن میں اس کو کم از کم اتنی آزادی حاصل ہو۔ اگر یہ نہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان کو آزادی وطن سے کسی قسم کی دلچسپی ہو۔ اس میں مسلمان کی کوئی خصوصیت نہیں۔ دنیا کی کسی قوم یا کسی جماعت سے بھی آپ یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ کسی ایسی جنگ آزادی وطن میں شریک ہونے کے لیے تیار ہوگی جس میں اسے اپنے قومی یا جماعتی مقاصد حاصل ہونے کی امید نہ ہو۔ پھر اگر کہیں کوئی تحریک آزادی علانیہ ایسے طریقوں پر چلائی جائے جو کسی قوم کے مفاد بلکہ عین اس کے قومی وجود ہی کو نقصان پہنچانے والے ہوں، اور اس پر بھی کوئی شخص اس قوم سے یہ توقع رکھے کہ وہ

ایسی تحریک میں جوق جوق شریک ہوگی تو ایسے شخص کو مشورہ دیا جائے گا کہ کسی دماغی ہسپتال کی طرف رجوع کرے۔ ہر قوم میں ایسے افراد تو آپ کو ضرور مل جائیں گے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنے اوپر ایسی غیر فطری حالت طاری کر سکتے ہوں کہ آزادی وطن کے لیے خود اپنی قوم کے مفاد کو قربان کر دینا ان کو گوارا ہو۔ اور ایسے افراد بھی آپ کو مل سکیں گے جن کو دن کی روشنی میں بھی ایک ظاہر چیز نظر نہ آتی ہو اور وہ آنکھ بند کر کے لشکر آزادی کے پیچھے چلے جائیں، مگر پوری قوم کی قوم نہ اندھی ہو سکتی ہے اور نہ اپنے خلاف خود خیانت کر سکتی ہے، اس لیے ایسی قوم آپ کو کہیں نہیں مل سکتی۔

آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ آزادی کی یہ فوج، جس کا نام کانگریس ہے، کس طرف جا رہی ہے، اور جس سمت پر یہ جا رہی ہے، کیا اس کے ساتھ اسی سمت پر چل کر مسلمان کبھی اپنے اس مقصد کو پہنچ سکتے ہیں جس کی تشریح ہم نے اوپر کی ہے، نیز یہ کہ مسلمانوں کے متعلق جو پالیسی کانگریس نے اختیار کی ہے وہ کس نوعیت کی ہے، اس سے مسلمانوں پر کیا اثرات مترتب ہو رہے ہیں اور آئندہ کیا نتائج برآمد ہونے کی توقع ہے۔

ان امور کی تحقیق کے لیے میں اپنی بحث کی ابتدا پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری سے کروں گا اس لیے کہ جواہر لال ہی اس پالیسی کے مصنف ہیں جس پر کانگریس اس وقت مسلمانوں کے ساتھ معاملہ کر رہی ہے اور انہی کی ہدایت و رہنمائی میں مسلم عوام سے ربط قائم کرنے کا جدید طریقہ اختیار کیا گیا ہے لہٰذا اُن سے بہتر کوئی شخص ہم کو یہ نہیں بتا سکتا کہ اس پالیسی کی تہ میں در اصل کونسے محرکات کام کر رہے ہیں اور کیا مقاصد پیش نظر ہیں علاوہ بریں جواہر لال وہ شخص ہے جس سے توقع کی جاتی ہے کہ کانگریس میں گاندھی کی جگہ وہی لے گا، اور اب بھی گاندھی کے بعد وہی کانگریس میں سب سے زیادہ طاقت ور آدمی ہے، لہٰذا ہم یہ سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ تحریک آزادی وطن کی جو منزل مقصود اس کے پیش نظر ہے اسی کی طرف وہ بالآخر کانگریسی نظام کو کھینچ لے جائیگا۔ (باقی)

مقالات

ہندوستان میں اسلامی تہذیب

از پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب

(یہ اس انگریزی خطبہ کا ترجمہ ہے جو ڈاکٹر صاحب نے گذشتہ ماہ اگسٹ میں "مسلم کلچر سوسائٹی حیدر آباد" کے تحت ایک جلسۂ عام میں پڑھا تھا خطبہ کی اہمیت متقاضی ہے کہ ناظرین غور سے اس کا مطالعہ فرمائیں۔)

سوال کیا گیا ہے اور بار بار دہرایا گیا ہے کہ اسلامی تہذیب کیا چیز ہے اور ہندوستان میں کہاں پائی جاتی ہے؟ ایک زمانہ تھا جب کہ مشکل ہی سے کسی کے ذہن میں یہ سوال کرنے کا خیال آ سکتا تھا۔ علمی صحبتوں میں ہم ہندو مسلم انگریزی اور دوسری مخصوص جماعتی تہذیبوں کے متعلق دل کھول کر گفتگو کیا کرتے تھے اور اپنے گذشتہ کارناموں کو جو علوم و فنون، فلسفہ، اور زندگی کے دیگر مظاہر میں رونما ہوئے یاد کرکے لطف اندوز ہوتے تھے۔ کسی جماعت کو یہ خیال نہ تھا کہ دوسری جماعت کے تہذیبی ورثہ سے انکار کرے، اگرچہ ہر جماعت اپنے من بھاتے کے لیے ہر چیز کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک خاص معیار قرار دے لیا کرتی تھی۔ یہ ایک فطری طریق کار تھا جس میں اب انتشار پیدا کیا جا رہا ہے اور ہم سے قومیت کے نام پر یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم اپنی انفرادی تہذیب کو نظر انداز کر دیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جدید تمدن کی روشنی میں بالخصوص مسلمانوں کی تہذیب کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ صرف شبہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ تحدی کی جاتی ہے کہ آیا موجودہ زمانہ میں یہ تہذیب کسی زندہ متحرک صورت میں موجود بھی ہے یا نہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے ہر گوشہ میں تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بے چینی

سی پیدا ہو گئی ہے۔

مسلم تہذیب کا مسئلہ فرقہ بندی نہیں بادی النظر میں یہ ایک سادہ سا سوال ہے، اور علمی بنیاد پر اس کا جواب بہت سیدھے سادے طریقہ سے دیا جا سکتا ہے، لیکن ہر شخص جانتا ہے، اور یہ ایک بدنصیبی ہے کہ یہ سوال خالص علمی وجوہ سے پیدا نہیں ہوا ہے۔ اس کا اصل منشا ایسی معلومات حاصل کرنا نہیں ہے جن سے انسانی زندگی کے لیے اسلامی تہذیب کی قدر و قیمت سمجھنے اور اس کا اندازہ کرنے میں آسانی ہو۔ بلکہ اصل منشا یہ ہے کہ مسلمان جو اپنی تہذیب کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں ان کی راہ میں اس سوال سے ایک اچھی رکاوٹ کا کام لیا جا سکے۔ یہ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ایک اور مصیبت بھی ہے۔ جن لوگوں نے یہ سوال ایجاد کیا ہے ان کے لائحۂ عمل کا ایک جز یہ بھی ہے کہ جب کوئی ان کے سوال کا جواب دے تو "فرقہ پرستی" کا آوازہ کس کر اس کا منہ بند کر دیں۔

یہ ہے اس وقت کی صورت حال اور یہ عجیب صورت حال ہے۔ آپ ایک سوال کرتے ہیں مگر اس کا جواب سننا نہیں چاہتے۔ یا سن بھی لیتے ہیں تو ایک سبق جو اپنے پہلے سے یاد کر رکھا ہے اسی کو رٹتے چلے جاتے ہیں کہ: "ہم نہیں مانتے، یہ سب فرقہ پرستی ہے" ـــ اسی لیے آج اس موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مجھے آپ ہی آپ کچھ جھجک سی محسوس ہوتی ہے، کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ میرے خیالات کا غلط مفہوم لیا جائے اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ اتنی در دسری کے بعد اسی الزام (فرقہ پرستی) سے میری بھی تواضع کی جائے۔

واضح رہے کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور سیاسی بولی کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتا لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ کسی نقطۂ نظر یا کسی خاص فلسفۂ زندگی کی توضیح کرنا یا لوگوں کی بے خبری دور کرنے کے لیے کسی ایسی حقیقت کا اظہار کرنا جو ہمارے علم میں ہو، فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اسی طرح کسی قوم کی تہذیب پر بحث کرنا اور یہ تبلانا کہ اس کا ذہن کس طرح اس کی زبان و ادب میں، اس کے علوم و فنون

اور فن تعمیر میں، اس کے افکار و اعمال میں، اس کے شخصی قوانین اور معاشری و معاشی نظام میں اور اس کے تصورِ حیات میں صورت پذیر ہوا ہے، یا اس امر کی صراحت کرنا کہ یہ سب چیزیں مل جل کر کس طرح اس کی جداگانہ سیرت کی تشکیل کرتی ہیں، بالیقین فرقہ پرستی نہیں ہے۔

ہر تہذیب ایک زندہ نظام ہوتی ہے۔ عموماً وہ کسی خاص قوم کی معاشرت سے ظہور پذیر ہوتی ہے اور پھر اُسی پر اثر ڈال کر تازہ قوت حاصل کرتی ہے۔ اس کی ترقی اور اس کا تنزل دونوں اسی قوم کی زندگی کے ساتھ ہوتے ہیں جو اس کی حامل ہو۔ اور بعض تہذیبیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک زندہ تخیل کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ اور زندگی کے کسی روحانی قانون کا منشا پورا کرتی ہیں۔ اس قسم کی تہذیب پھیل کر عمومیت کے ساتھ نوعِ انسانی پر اثر ڈالتی ہے اور اختلافِ رنگ و نسل کے متصادم اغراض میں ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ اس کا اپنا کوئی خاص مسکن نہیں ہوتا۔ وہ جہاں جاتی ہے اور جو لوگ اس کا اثر قبول کرتے ہیں ان کو وہ اپنا نام دے دیتی ہے۔ اگر وہ ہاتھ کمزور ہو جائیں جو اس کو تھامے ہوئے ہوں تو اُن سے چھوٹ کر وہ ناپید نہیں ہو جاتی بلکہ دوسرے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا نام ان کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔ اس طرح وہ زندہ رہتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔ ہم اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ان لوگوں سے نہیں کرتے جن کے ہاتھوں میں اس کے سنبھالنے کا سکت نہیں رہا بلکہ ان لوگوں کے لحاظ سے اسے جانچتے ہیں جن کے ہاتھوں نے اسے مضبوطی کے ساتھ تھاما ہو یا جنہوں نے اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم خود اس کی ذاتی قوت سے اس کی نسبت رائے قائم کرتے ہیں۔ یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے کہ کسی ہنگامی سیاسی غرض کے لیے ایسی تہذیب سے جھگڑا کیا جائے بلکہ دانشمندی کا اقتضا یہ ہے کہ اس سے نوعِ انسانی کی ترقی کے لیے ایک مددگار قوت کی حیثیت سے استفادہ کیا جائے۔

ایسی ہی ایک تہذیب ہے جس کے متعلق آج کی شام میں آپ کے سامنے کچھ کہنا چاہتا ہوں اور

مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنا فرقہ پرستی نہیں ہے۔ اس حد تک اگر آپ مجھ سے متفق ہو جائیں تو میرا کام بہت کچھ ہلکا ہو جائے گا کیونکہ پھر مجھے اس سوال کے سیاسی پس منظر کا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ تاہم دو ایک باتیں اور ہیں جن کو میں آگے بڑھنے سے پہلے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

اسلامی تہذیب کا موضوع اس قدر وسیع ہے کہ اس پر ایک لکچر میں بحث کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میں اسے پیش کرنے کے لیے کونسا نہج اختیار کروں گا جس سے بآسانی یہ سمجھا جا سکے کہ یہ تہذیب کیا ہے اور ہندوستان میں کہاں پائی جاتی ہے۔

مسلمان کے ذہن نے تاریخ کے دوران میں اپنی خصوصیات کو تہذیب کے ہر میدان میں نمایاں کیا ہے ___ میدانِ عمل، میدانِ فکر، میدانِ تخلیق ___ یہی تین بڑے میدان ہیں جن میں انسان کی پوری کارگذاری منقسم ہوتی ہے اور ان میں سے ہر میدان میں مسلمان نے اپنا ایک نقش قائم کیا ہے۔ عمل کے میدان میں اس نے ایک خاص قسم کا نظامِ معیشت و معاشرت اور ایک خاص قسم کا نظامِ سیاست و عمران پیدا کیا جو خود اس کے اپنے اصول قانون کا پروردہ ہے اور ایک ہمہ گیر ضابطہ کی شکل اختیار کر گیا ہے جس کا نام شریعت ہے۔ میدانِ فکر میں اس کی فطانت نے جدید سائنس کا سنگ بنیاد رکھا اور اس کے آئندہ ارتقاء کی راہ متعین کر دی۔ میدانِ تخلیق میں اس نے اپنی روح کی حرکت سے زندگی کے جمال کو نکھارنے اور مالامال کر دینے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ اسی طاقت ہی کا ظہور تو ہے جو اس کے ادب میں، اس کے فنونِ لطیفہ میں، اس کے فلسفہ و مذہب میں ہوا ہے۔ غرض یہ ایک جامع تہذیب ہے جس کا ہر پہلو بذاتِ خود ایک بڑا موضوع ہے۔ ہر تہذیب کی طرح خصوصیت کے ساتھ اس کا معاشری پہلو وقتاً فوقتاً دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوتا رہا ہے اور یہ اثر زیادہ تر ادنیٰ درجہ کے جزئیات میں نمایاں نظر آتا ہے جس کی وجہ کچھ تو موسمی حالات ہیں کچھ وہ ضروریات ہیں جو مختلف ملکوں میں پھیلنے اور مختلف قوموں کے ساتھ رہنے سہنے سے پیدا ہوئیں اور

کچھ انفرادی مذاق اور شخصی بے راہ رویوں کے نتائج ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود اس کا ڈھانچہ اپنی پوری ہیئت ترکیبی کے ساتھ مسلمانوں کی زندگی پر مضبوط جما ہوا ہے۔ اس کے وجود کو معرض سوال میں لانا اور یہ پوچھنا کہ اسلامی تہذیب کیا ہے؟ اور کہاں پائی جاتی ہے؟ ایک ایسا فعل ہے جس کو میں بہت نرم الفاظ میں عقلی خود فریبی سے تعبیر کرونگا۔ میں آپ کو اس سے خبردار کر دینا چاہتا ہوں۔ اسلامی تہذیب یہاں ہندوستان میں اسی طرح موجود ہے جس طرح وہ ان ممالک میں موجود ہے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور اس سے آنکھیں بند کر لینے کی نسبت زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس کے وجود کو کھلے دل سے تسلیم کر لیا جائے اور یہ دیکھنے کی کوشش کی جائے کہ اس ملک کو بلند ترین سیاسی ارتقا کے مرتبہ تک پہنچانے میں اس سے کس طرح مدد لی جا سکتی ہے۔ آج کی تقریر میں میرا مدعا اس امر پر زور دینا ہے کہ مسلمانوں کی یہ تہذیب اب بھی زندہ ہے اور اس مقصد کے حصول میں مدد دینے کی طاقت رکھتی ہے۔

میں ان مختلف شعبوں پر تبصرہ کرنا نہیں چاہتا جن میں اس تہذیب نے تاریخ کے دوران میں اپنے آپ کو ظاہر کیا ہے کیونکہ یہ ایک قسم کی علمی نمائش ہوگی اور آپ کے لیے بھی بار خاطر ہو جائیگی۔ بخلاف اس کے میں آپ سے یہ خواہش کرونگا کہ آپ اس روح کو محسوس کریں جو مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں کارفرما ہے اور ان کی تہذیب کی پوری عمارت کو تھامے ہوئے ہے۔ بالفاظ دیگر میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بنیاد پر توجہ کریں جس پر اسلامی تہذیب قائم ہے۔ اگر اس بنیاد کو صحیح طور پر سمجھ لیا گیا تو میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلمانان ہند کے تہذیبی تحفظات کو سمجھنے میں جو دشواریاں پیش آرہی ہیں بڑی حد تک دور ہو جائیں گی۔

پنڈت نہرو کے خیالات پر تبصرہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لیے ایک مددگار قوت ہونے کی حیثیت سے اسلامی تہذیب کی قدر و قیمت کو سمجھنے میں جو دشواری پیش آتی ہے اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ جو لوگ اس کو معرض سوال میں لاتے ہیں وہ غیر متعلق خیالات میں بھٹک گئے ہیں اور اس کا

کوئی صحیح تصور ہی ان کے ذہن کی گرفت میں نہیں آسکا ہے کہ تہذیب کہتے کس چیز کو ہیں اور وہ کن عناصر ترکیبی سے وجود میں آتی ہے۔ اپنے مطلب کو ذہن نشین کرنے کی خاطر میں ضروری سمجھتا ہوں کہ شروع ہی میں آپ کو ایسے خیالات سے متنبہ کردوں۔ مثال کے طور پر میں پنڈت جواہرلال نہرو کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو خاص وجہ سے منتخب کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی خاموش فضا میں رہکر میں اپنے ملک کے قائدین کے کارناموں کا مدت سے خاموشی کے ساتھ مشاہدہ کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پنڈت جی ان چند افراد میں سے ہیں جو کسی بڑے مقصد کو بنا یا بگاڑ سکتے ہیں۔ ان کے اندر خلوص کے ساتھ کام کرنے کی کافی ہمت و قوت ہے اور اسی لیے یہ امر بہت زیادہ افسوسناک ہوگا کہ ان کی ہمت و قوت خاص کر اس زمانہ میں جب کہ وہ ایک بڑے اعتماد اور اثر کے مرتبہ پر فائز ہیں، ہندوستان کے اسلامی مسئلہ سے غلط یا نامناسب طریقہ پر تعرض کرنے میں ضائع ہو۔ وہ فرماتے ہیں:-

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ "اسلامی تہذیب" کیا ہے لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے منھی بھر مسلمان اور ان ہی کی طرح ہندو فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں۔ جب عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں:- ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لیے چھوڑ دینا۔ اور ایک خاص قسم کی ٹونٹی والا لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں یعنے دھوتی پہننا سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی در اصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جارہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں شکل سے فرق کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ شاذ ہی ڈاڑھی رکھتا ہے۔

اگرچہ علی گڈھ ابھی تک سرخ ترکی ٹوپی کا گرویدہ ہے (اس کا نام "ترکی" ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں ساڑی پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں۔ خود میرا ذوق ان میں سے بعض عادتوں کو پسند نہیں کرتا اور میں ڈاڑھی مونچھ یا چوٹی نہیں رکھتا۔ لیکن میں اپنے ذوق کا قانون دوسروں پر مسلط کرنے کی بھی خواہش نہیں رکھتا۔ اگرچہ ڈاڑھی کے متعلق مجھے اعتراف ہے کہ جب امان اللہ نے کابل میں ڈاڑھیوں کا صفایا شروع کر دیا تو مجھے بڑی مسرت ہوئی تھی۔"

اس عبارت میں آپ دیکھیں گے کہ پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے ذہن اور روح کے مظہر کو جو اصل تہذیب ہے ان کے پاجاموں، ان کی ترکی ٹوپی، اور ان کی ڈاڑھی میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیا ایک سنجیدہ محقق کے لیے حقائق کی دریافت کا یہی طریقہ ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ اپنے ذاتی تعصبات رکھتا ہے۔ ہم سب میں یہ عیب تھوڑا بہت موجود ہے۔ یہ خلقی کمزوری بالعموم صحیح رائے قائم کرنے میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ مگر جب تعصبات مکابرے اور تعدی کی قسم کے ہو جاتے ہیں تو نظر کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

اپنی خود نوشتہ سوانح حیات کے اس باب میں جس سے میں نے اقتباس بالا پیش کیا ہے پنڈت نہرو بیان کرتے ہیں کہ ترکی نے مذہب چھوڑ دیا ہے — ایران اپنی تہذیب میں جان ڈالنے کے لیے اسلام سے پہلے کے دور کی طرف رجوع کر رہا ہے — حتیٰ کہ مصر بھی اس راستہ پر گامزن ہے اور اپنی سیاست کو مذہب سے الگ کر رہا ہے — آگے چل کر میں بتلاؤں گا کہ جس چیز کو وہ ان ممالک میں تغیر سمجھتے ہیں اس کی حقیقت کو سمجھنے سے وہ اسی طرح قاصر ہیں جس طرح ہندوستان کی اسلامی تہذیب ان کی سمجھ میں نہیں آئی — بہرحال انہی مفروضہ تغیرات کی بنیاد پر وہ سوال کرتے ہیں کہ۔

"مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ برطانیہ کی شفیق حکومت کے

تحت شمالی ہند میں پھلتی پھولتی رہیں گی۔"

اور خود اس کا جواب دیتے ہیں کہ :-

"مسلم قوم کے وجود کا خیال چند لوگوں کی قوت واہمہ کا کرشمہ ہے۔ اگر اخبارات اس خیال کو اس قدر شہرت نہ دیتے تو یہ نام بھی بہت کم لوگوں نے سنا ہوتا۔ اور اگر بہت سے لوگ اس پر یقین بھی رکھتے تب بھی حقیقت کی ایک جھلک اس کو کافور کر دیتی۔"

مجھے اندیشہ ہے کہ اس موضوع سے بحث کرنے کا یہ انداز کچھ حقارانہ سا ہے اور مزید برآں حسب سابق غیر علمی بھی ہے۔ شبہ استدلال کا ایک خطرناک آلہ ہے۔ اکثر اس سے یہ راز فاش ہو جاتا ہے کہ قائل کو حقائق پر دسترس حاصل نہیں۔ نیز اس سے غلط فہمیوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے اپنے طرز فکر اور طرز زندگی کی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی خواہش سب ہی میں ہوتی ہے اور یہ ایک فطری خواہش ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کوئی گروہ اپنی تہذیب کا احترام بھی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ کیر کٹر کی اس طاقت سے جو اس کی تہذیب پیدا کرتی ہے ایک مشترک نظام حکومت کی ترقی اور بہبودی میں حصہ بھی لے ؟

اسلامی تہذیب کی بنیادوں پر بحث کرنے سے پہلے میں پنڈت نہرو کا ایک اور اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ عبارت اُن کی ایک حالیہ تحریر سے ماخوذ ہے۔ اصلی حقائق کی جگہ فروعات میں اُلجھنے اور پورے چمن کی سیر کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ میں دلچسپی لینے کی عادت کا ایک اچھا نمونہ آپ کو اس عبارت میں ملے گا :-

"اقوام بہت سی ان چیزوں کو جو ان کی خصوصیات میں سے ہیں جیسے زبان۔ عادات۔ طرز فکر وغیرہ ایک طویل عرصہ تک محفوظ رکھ سکتی ہیں اور رکھیں گی۔ لیکن مشین کا عہد اور سائنس ان میں اپنی سیاحت کی تیز رفتاری اور عالمی خبروں کی مسلسل فراہمی اور ریڈیو اور

سینما وغیرہ سے برابر یکسانیت پیدا کرتے رہیں گے۔ اس ناگزیر رجحان کا کوئی شخص مقابلہ نہیں کرسکتا اور صرف ایک عالمگیر تباہی جو موجودہ تمدن کو درہم برہم کردے اس کو روک سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے روایتی فلسفۂ حیات میں بہت سے اختلافات ہیں۔ لیکن یہ اختلافات مشکل ہی سے قابل اعتنا رہتے ہیں جب کہ ان دونوں کا مقابلہ زندگی کے جدید سائنٹفک اور صنعتی نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے اور اول الذکر دونوں نقطہائے نظر کے درمیان ایک بہت بڑا اختلاف ہے۔ آج ہندوستان میں حقیقی کشمکش ہندو تہذیب اور اسلامی تہذیب کے درمیان نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں میں اور جدید تمدن کی اس سائنٹفک تہذیب میں ہے جو سب پر غلبہ پا رہی ہے۔ "اسلامی تہذیب" جو کچھ بھی ہو بہرحال جو لوگ اس کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں انھیں ہندو تہذیب کے مقابلہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس دیو کا مقابلہ کرنا چاہیے جو مغرب کی طرف سے آرہا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے تو اس امر میں مطلق شبہ نہیں کہ وہ تمام کوششیں ناکام ہی رہیں گی جو صنعتی تہذیب کے خلاف کی جا رہی ہیں خواہ وہ ہندوؤں کی کوششیں ہوں یا مسلمانوں کی، اور میں بغیر کسی ملال کے اس ناکامی کا مشاہدہ کروں گا۔"

یہاں پنڈت نہرو نے دو قسم کی اشیاء میں امتیاز کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک قسم کی اشیاء تو وہ ہیں جو انفرادی طور پر ایک ایک قوم کے ساتھ مختص ہیں جیسے زبان، عادات، افکار اور فلسفۂ حیات۔ اور دوسری قسم کی اشیاء وہ ہیں جو عمومیت کے ساتھ سب پر اثر انداز ہوتی ہیں، مثلاً وہ چیزیں جو مشین کا عہد فراہم کرتا ہے: سیاحت کی تیز رفتاری، عالمی خبروں کی فراہمی، ریڈیو اور سینما وغیرہ۔ پنڈت نہرو کی رائے میں جو چیز کسی قوم کی تہذیب کو بناتی ہے وہ اشیاء کا آخر الذکر مجموعہ ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں لغزش کھا کر پنڈت جی کی قوت فیصلہ بے راہ ہوگئی ہے۔ انہوں نے

بس ایک چیز کو دوسری چیز سے خلط ملط کر دیا ہے جن چیزوں کو وہ اقوام کی انفرادی خصوصیات میں شمار کرتے ہیں یعنی زبان عادات طرز فکر — اور بھی بہت سی چیزیں ہیں — در اصل وہی چیزیں ایک قوم کی تہذیب کو ایک مخصوص تہذیب بناتی ہیں اور اسے دوسری قوم کی تہذیب سے ممتاز کرتی ہیں۔ مسلمان اپنے فرقہ کی انہی "مخصوص چیزوں" کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح کہ مہاتما گاندھی جیسے مشاہیر بھی اپنی ان چیزوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہند و تہذیب کے لیے مخصوص ہیں۔ رہیں وہ چیزیں جو مشین کے عہد کی پیداوار ہیں تو ہر شخص کو سنجیدگی کے ساتھ خود اپنے نفس سے سوال کرنا چاہیے کہ آیا وہ سینما ریڈیو اور ایسی ہی چیزوں کو اپنی زندگی میں وہی رتبہ دینے کے لیے تیار ہے جیسا مذکورۂ بالا قومی خصوصیات کو؟ ظاہر ہے کہ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو قومی زندگی میں کوئی روح پیدا کر سکتی ہوں۔ جب ضرورت ہوتی ہے یہ چیزیں وجود میں آتی ہیں اور جب ان کی ضرورت نہیں رہتی دوسری آسائشیں ان کی جگہ لے لیتی ہیں۔ ہمارے لیے قوت برقی کی طرح یہ بھی محض غیر شخصی قوتیں ہیں۔ کوئی انسان برقی قوت کو استعمال نہیں کر سکتا تا وقتیکہ اس کو ضابطہ میں لانا نہ جانتا ہو۔ لیکن اس سے واقف ہونا بذات خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ بذات خود تمدن کی کوئی علامت نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ مقصد جس کے لیے اس قوت کو استعمال کیا جاتا ہے، یا وہ روح جو اس کے استعمال کے پیچھے کارفرما رہتی ہے در اصل وہی زندگی میں ایک فیصلہ کن عنصر ہے آپ قوت برقی کو آرام و آسائش کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں اور تباہ کن اغراض کے لیے بھی اس کو کام میں لا سکتے ہیں جیسا کہ آج یورپ میں ہو رہا ہے۔ اصل چیز مقصد ہے اور اسی مقصد کی نوعیت یا بالفاظ دیگر زندگی کا نقطۂ نظر ہی وہ چیز ہے جو ایک قوم کی تہذیب اور دوسری قوم کی تہذیب میں امتیاز پیدا کرتی ہے محض سائنس کی آفریدہ چیزوں سے آپ ایک ہمرنگ عالمگیر تہذیب کو ہرگز وجود میں نہیں لا سکتے مشین سے جو یکسانیت پیدا ہو سکتی ہے وہ زندگی کے محض خارجی اور سطحی پہلوؤں

تک ہی محدود رہے گی مگر وہ آپ کی روح پر قابض نہیں ہو سکتی اور اس کا موجود ہونا اس بات کا پتہ نہیں دیتا کہ اس کے پیچھے ایک عالمگیر نفس کام کر رہا ہے۔ حالانکہ عالمگیر تہذیب ایک عالمگیر نفس ہی سے وجود میں آسکتی ہے اور عالمگیر نفس کا وجود صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ انسان دل و جان سے زندگی کے ایک عالمگیر روحانی و اخلاقی قانون کے زیر اثر کام کرنا سیکھ لے۔ نارمن بنٹ وچ جو بیت المقدس کی عبرانی جامعہ میں بین الاقوامی قانون صلح کے وازمن پروفیسر ہیں کہتے ہیں کہ

> "ہمارے زمانہ کے شدید ترین سیاسی مصائب میں سے ایک یہ ہے کہ جدید سائنس نے انسانی روابط میں اضافہ تو کر دیا ہے اور مختلف اقوام کے درمیان سے زمان و مکان کے فصل کو تقریباً مٹا بھی دیا ہے لیکن بین الاقوامی تعلقات کو قانونِ اخلاق کے تحت لانے میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔ دنیا سیاسی اور معاشی حیثیت سے باہم مربوط ہے۔ آج مثلاً چین و جاپان میں جو واقعات پیش آتے ہیں وہ یورپ اور امریکہ کی قوموں اور مملکتوں پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ مگر ملکوں کے باہمی تعلقات اخلاقی اصولوں کے تابع نہیں ہیں اور قومیں ایمانداری کے ساتھ اپنے مقدس معاہدات کی پابندی نہیں کرتیں اس لیے روابط کی یہ کثرت و قربت امن عالم کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔ قوموں کے مذاہب جو سب کے سب چند خاص اخلاقی اصولوں کے علمبردار ہیں نیز امن و عدل کے مشترک نصب العین کے حامی ہیں ایک ایسے عالمگیر اخلاقی قانون کی بنیاد پیش کرتے ہیں جس کے نفاذ کے بغیر انسانی تمدن کا برقرار رہنا محال ہے۔"

اسلامی تہذیب کی بنیادی خصوصیت یہی وہ حقیقت ہے جس کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ آپ اس ملک میں کوئی پائدار قومیت محض سطح کی مشترک چیزوں پر تعمیر نہیں کر سکتے۔ تہذیب کا اصلی مستقر انسان کا نفس ہے جو زندگی کے ہر میدانِ عمل میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ اب یہ تحقیق کرنا ہے کہ یہ نفس مختلف مظاہر تہذیب میں ایک اجتماعی نفس کی حیثیت سے کس طرح ظاہر ہوتا ہے تاکہ ہم ان کے درمیان رواداری کے

عالمگیر اخلاقی قانون کی بنیاد پر باہمی موافقت کا ایک قابل عمل نقشہ بنا سکیں۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور اس کو ہم پورا نہیں کر سکتے جب تک کہ ہمارے سامنے اس تہذیب کا تصور واضح طور پر موجود نہ ہو جسے ہم اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔

اسلامی تہذیب نہ عربی ہے نہ ایرانی جیسا کہ پنڈت جواہر لال کا گمان ہے۔ وہ نہ نسلی ہے نہ قومی بلکہ اگر میں اسے کسی نام سے تعبیر کر سکتا ہوں تو وہ قرآنی تہذیب ہے۔ آپ چاہیں تو اسے مذہبی تہذیب کہہ لیجیے۔ لیکن قرآنی تہذیب کی حد تک کسی شخص کو مذہب کا نام آنے سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ قرآن کا مذہب ایسا مذہب نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ مذہب کا مفہوم سمجھتے ہیں۔ یہ صرف مراقبوں سے پرورش نہیں پاتا۔ یہ نہ مرتاضیت ہے نہ رہبانیت۔ اور نہ یہ ایسی مظاہر پرستانہ رسموں کا مجموعہ ہے جن کو مذہب کے موروثی پیشوا ادا کرتے ہوں۔ یہ محض ایک اعتقاد یا اذعان نہیں ہے۔

اسلام ایک اجتماعی مسلک کی حیثیت سے | اس کے برعکس اسلام کے نام سے جس چیز کو موسوم کیا گیا ہے وہ زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے اور امت مسلمہ سے ایک خاص قسم کا اجتماعی نظام مراد ہے جس کو زندگی کا یہ خاص نقطۂ نظر وجود میں لاتا اور پروان چڑھاتا ہے۔ یہ تصورِ حیات اور یہ نظام اجتماعی فی نفسہٖ جیسا ہے اس کے متعلق آپ گفتگو کر سکتے ہیں بغیر اس کے کہ خدا کا کوئی ذکر آئے، اگر آپ کی افتاد طبع ایسی ہی ہے کہ آپ خدا کا ذکر سننا نہیں چاہتے۔ اسلام پھر بھی ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے اسلام ہی رہے گا، اور آپ اس کو سلامت روی کا ایک طریقہ پائیں گے۔ وہ ایک خاص قسم کا طرز زندگی ہے اسی طرح جس طرح کہ کمیونزم، سوشلزم، فاشزم، اور نازی ازم، خاص قسم کے طرز زندگی ہیں۔

ان مختلف طرزوں کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ یہ انسانی قوت عمل کو کسی خاص نصب العین یا متعین مقصد کی راہ پر لگانے کی کوششیں ہیں۔ ممکن ہے ایسے لوگ موجود ہوں جو ہر اس مذہب کو جس میں حیات بعد الموت تسلیم کی جاتی ہے فی الحقیقت ناپسند کرتے ہوں۔ ایسے افراد کے لیے کسی خاص عقیدے

کا فقدان ہی ایک مذہب ہے۔ کوئی بہتر اصطلاح نہ ملنے کی وجہ سے لوگ اُن کی روش کو مادّیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ بہرحال انہی طریقوں میں سے کسی نہ کسی طریقہ کو ہر شخص اختیار کرتا ہے۔ کبھی محض پیدائش کی وجہ سے ایک طریقہ اس کے لیے آپ مقرر ہو جاتا ہے اور کبھی انسان خود اس کا انتخاب کرتا ہے۔ زندگی کے مختلف طریقوں کا محقق ان کے درمیان موازنہ کرتا ہے اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دیتا ہے۔ لیکن ایک مخلص پیرو کے نزدیک اس کی عملی پابندی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو پر بھی یہی بات صادق آتی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ انہیں اشتراکیت پر اعتقاد ہے، اور یہی بات مسلمان پر بھی چسپاں ہونی چاہیے جب وہ کہتا ہے کہ اسے اسلام پر اعتقاد ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ اس خاص طرز زندگی اور اس خاص نظام اجتماعی پر اعتقاد رکھتا ہے جس کو قرآنی یا اسلامی کہا جاتا ہے۔ آپ اُسے مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اپنے آپ کو بھول جائے یا تمدنی تعلقات اور سیاسیات میں اپنے مسلک کو چھوڑ دے۔ اگر اتفاق سے فریقین کے مسلک بعض معاملات میں ایک دوسرے سے مل جاتے ہوں یا کم از کم ان کے درمیان براہ راست کوئی تصادم نہ ہوتا ہو تو ان معاملات کی حد تک دونوں ایک راستے پر مل کر چل سکتے ہیں مگر جب بنیادی امور میں دونوں کے طریق فکر و نظر بالکل مختلف ہوں تو نظر فریب دلائل اور سفسطہ کے کسی بڑے سے بڑے طومار سے بھی کوئی کام نہیں چل سکتا یہاں تک کہ حب وطن کے نام پر اپیل کرنا بھی بے نتیجہ رہتا ہے کیونکہ حب وطن کا نام دونوں لیں گے مگر اس کی تعبیر دونوں اپنے اپنے مسلک کے مطابق کریں گے۔ یہی صورت حال ہے جو مسلمانوں اور اس ملک کی اکثریت کے مابین پیدا ہو گئی ہے اور یقیناً تدبر کا تقاضا یہ ہے کہ ان دو بڑے فرقوں کے اختلافِ نظر کا ٹھنڈے دل سے تجزیہ کر کے یہ تحقیق کیا جائے کہ کس بنیاد پر حقیقی اتحادِ عمل ممکن ہے میں سمجھتا ہوں کہ اختلافات کو نیک نیتی کے ساتھ زیر بحث لانا اتحاد کا پہلا قدم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اتحاد چاہنے اور اختلاف پر گفتگو کرنے میں تضاد نظر آئے مگر اس کا تو مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔

حرکت اور وحدت کی تہذیب جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں اسلام ایک ایسا مسلک ہے جو ایک خاص نظام اجتماعی کو پیدا کرنا اور چلانا چاہتا ہے اور اسی لیے زندگی کی دو بنیادی حقیقتوں پر خاص طور سے زور دیتا ہے ان میں سے ایک حقیقت کو میں "حرکت فی الحیات" سے تعبیر کرسکتا ہوں اور دوسری کو "وحدت فی الحیات" یہ دونوں ایک ضابطۂ عمل سے مربوط ہیں جس کو شریعت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آپ اس شریعت کو قانون اسلام کہہ سکتے ہیں۔ اسی قانون یا ضابطۂ عمل کے حدود کے اندر ایک مسلمان کو رہنا اور کام کرنا ہے۔ یہ حدود تنگ نہیں ہیں جیسا کہ موجودہ لاعلمی اور انحطاط کی حالت میں نظر آتے ہیں۔ اسلامی تاریخ میں واقعات کی رفتار نے ایک سے زائد مرتبہ اس امر کی شہادت پیش کی ہے کہ جس قدر زندگی کی ان دو بنیادی حقیقتوں یعنی حرکت اور وحدت کو پیش نظر رکھا گیا اسی قدر شریعت اسلام نے اپنا اثر دکھایا اور اپنے پیرووں کو ضروری طاقت فراہم کر دی۔ ایک معنی میں یہ دونوں حقیقتیں جدا جدا نہیں بلکہ ایک ہی ہیں اور زندگی کا ایک ہی اخلاقی یا اجتماعی یا روحانی قانون پیش کرتی ہیں جس کو میں شریعت یعنی قانون اسلام کا مقدمہ (Preamble) کہہ سکتا ہوں۔ یہ قانون اٹل ہے اس لیے کہ جس اخلاقی قانون پر اس کی بنیاد قائم ہے وہ زندگی کا ایک فطری قانون ہے۔ میں اپنی ایک تازہ تصنیف میں اس پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں جس کا نام "اسلام میں سوسائٹی کا تصور" ہے۔ اس تقریر کے دوران میں بھی اس کی طرف اشارہ کروں گا۔

متحرک تہذیب یہ حرکت فی الحیات کیا چیز ہے جو اسلامی تہذیب کی بنیاد میں موجود ہے؟ میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ آج کی تقریر میں اس تخیل کی فلسفیانہ تشریح کرنا میرا منشا نہیں ہے اور نہ میرے فوری مقصد کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ آپ کو صرف یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ قرآن کے نزدیک زندگی ایک مسلسل حرکت ہے۔ ایک لامتناہی خط مستقیم ہے۔ چکر نہیں ہے۔ وہ متحرک ہے اور ہر آن اس کی ایک نئی شان ہے۔ مغربی سائنس اور فلسفہ میں ارتقا کا تصور کل کی چیز ہے لیکن مسلمانوں میں یہ اتنا ہی قدیم ہے

جتنا کہ قرآن مسلمانوں پر جب بازنطینی مسیحیت کے توسط سے یونانی افکار کا نیا نیا اثر پڑا تو ان کے بعض اہل فکر اس غلط فہمی میں پڑ گئے تھے کہ زندگی ایک جامد و ساکن چیز ہے لیکن زندگی کی قرآنی تعبیر بہت جلد سامنے آ گئی اور اس نے مسلمانوں کی عقلی زندگی میں ایسی تحریک پیدا کر دی کہ وہی حقائق علمیہ کی جستجو اور روح تحقیق کے بانی مبانی بن کر رہے۔

علوم و فنون کے دائرہ میں مسلمانوں نے جو کارنامے دکھائے ہیں ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں صرف برے فالٹ کی "تشکیل انسانیت" سے ایک دو اقتباس پیش کروں گا جس سے آپ کو مجموعی حیثیت سے یہ معلوم ہو جائیگا کہ حرکت کے اس اسلامی تخیل سے تحریک پا کر مسلمانوں نے جو کام کیے وہ کس قدر اہمیت رکھتے تھے:۔

"اگرچہ مغربی ترقی کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تہذیب کے گہرے اثر کا سراغ نہ لگایا جا سکے لیکن کسی اور جگہ یہ اتنا واضح اور نمایاں نہیں جتنا اس قوت کی پیدائش میں نمایاں ہے جو دنیائے جدید کی ایک مستقل اور ممتاز قوت اور اس کی فتحمندی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یعنی علوم طبعی اور روح تحقیق۔" (صفحہ ۱۹۰)

"ہمارے سائنس پر عربوں کا احسان بس اتنا ہی نہیں ہے کہ انہوں نے ہم کو چند انقلاب انگیز نظریات دے دئے ہوں حقیقت میں سائنس پر عربی تہذیب کا اس سے زیادہ احسان ہے، وہ خود اپنے وجود کے لیے اس کا احسان مند ہے۔ یونانیوں میں علم ہیئت اور علم ریاضی ایک باہر سے آئی ہوئی چیز تھی جو یونانی تہذیب میں گھل مل نہ سکی۔ یونانیوں نے تدوین، قیاس آرائی، نظریہ سازی ضرور کی لیکن صبر و سکون کے ساتھ لگاتار تحقیق و جستجو کرنا ثبوتی علم کے اجزاء کو سمیٹنا، دقیقہ رس مناہج اختیار کرنا، تفصیلی طریق پر پیہم مشاہدات اور تجربی تحقیقات کرنا یونانی مزاج سے مناسب نہیں رکھتا تھا۔ یونانی اثر کے دائرہ میں صرف

اسکندریہ ہی ایسا مقام تھا جہاں دنیائے قدیم میں علمی تحقیقات کی طرف قدم اٹھایا گیا تھا لیکن جس چیز کو ہم سائنس کہتے ہیں وہ یورپ میں تحقیق کی نئی روح اور تجربہ و مشاہدہ اور پیمائش کے نئے طریقوں اور علم ریاضی کی ایسی ترقی سے پیدا ہوئی جس سے یونانی ناآشنا تھے۔ اس روح اور ان طریقوں سے عربوں نے مغربی دنیا کو روشناس کرایا" (صفحہ ۱۹)۔

علمی کام کے مختلف میدانوں میں مسلمان کے ذہن نے جو کچھ کیا ہے اس کا مرقع اس سے زیادہ بڑے پیمانے پر کھینچا جاسکتا ہے اور اسلامی تاریخ کی مدد سے اس مرقع میں تمام جزئیات جمع کی جاسکتی ہیں مگر وہ سب اسی بنیادی انداز فکر کی طرف اشارہ کریں گی جو قرآنی تعلیم کے اثر سے ابھرا اور بڑھا۔ وہ اثر کیا تھا؟ یہی کہ زندگی ترقی کی ایک سعی پیہم ہے اور اس کی ضروریات کا ایک لازمی جزیہ ہے کہ انسان کے گردوپیش جو فطری قوتیں کام کررہی ہیں ان کے تعامل سے وہ موافقت پیدا کرے اور اس تعامل کا زیادہ سے زیادہ صحیح علم حاصل کرکے قوائے فطرت کو زندگی کے اس اولین مقصد کا خادم بنادے جو عبارت ہے نوع انسانی میں وحدت اور جمعیت کی افزائش سے۔

جدید تمدن سے کوئی تصادم نہیں | جب اصل حقیقت یہ ہے تو میں کہونگا کہ یہ ساری قیل و قال جو اسلامی تہذیب کے متعلق کی جارہی ہے اور یہ جو کہا جارہا ہے کہ جدید سائنٹفک دور کی ترقی کے سامنے اسلامی تہذیب اور اسلامی فکر اپنی خصوصیات کو محفوظ نہ رکھ سکے گی یا سعی و عمل کے راستہ سے دور پھینک دی جائیگی، محض بے معنی ہے۔ میں پنڈت نہرو کو یقین دلاتا ہوں کہ سائنس کے کارناموں سے مسلمان کے ذہن کو خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو چیزیں ان کے نزدیک موجودہ سائنٹفک تہذیب کی اساس ہیں وہ درحقیقت اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ اور اس کی بارآوری کی علامتیں ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس مقام سے لے کر جہاں مسلمانوں نے اس کو

چھوڑ دیا تھا اور اس مقام تک جہاں صدیوں کی غفلت اور خود فراموشی کے بعد اب دوبارہ وہ آ کے روشناس ہو رہے ہیں، ایک خلا اور وسیع خلا پڑ گیا ہے۔ اس وقت مسلمان جس انحطاط میں مبتلا ہیں (جو نتیجہ ہے متعدد تاریخی اسباب کا اور یہاں ان اسباب پر بحث کرنے کا موقع نہیں ہے) اُس نے ان کو استحقار کا ہدف بنا دیا ہے۔ ان کا ذہن غیر اسلامی تہذیبوں کے اثرات کا شکار ہو گیا ہے اور اس قابل نظر نہیں آتا کہ مغرب کی ترقی میں خود اپنی ابتدائی کوششوں کے نتائج دیکھ سکے۔ تاہم تعلیم اس حالت کو درست کر دے گی۔ تمام اسلامی دنیا میں ایک بیداری پیدا ہو چکی ہے اور ان غیر اسلامی حجابوں کو چاک کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جنہوں نے صدیوں سے مسلمانوں کو اپنے اصلی مقام کا مطالعہ کرنے سے روک رکھا ہے۔ ترکی نے قدم آگے بڑھایا ہے۔ سطحی نظر والوں کو، جو روحِ اسلام سے آشنا نہیں ہیں، ممکن ہے کہ یہ اقدام غیر اسلامی نظر آئے۔ مگر ہم جو اس روح کو جانتے ہیں، ہمیں ان واقعات پر کوئی اضطراب نہیں جو وہاں پیش آ رہے ہیں۔ ایران اپنی کھوئی ہوئی منزلت کو حاصل کر رہا ہے۔ ایک شخص یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ اسلام سے پہلے کی تہذیب کو زندہ کر رہا ہے، مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ فی الواقع ان دونوں ممالک میں اسلامی روح، حریتِ فکر و عمل کے لیے کوشاں ہے اور یہی چیز دوسرے ممالک میں بھی کم و بیش اسی طریقہ پر مقامی حالات و ضروریات کے لحاظ سے ذہن مسلم کی آزادی کے لیے کوشش کر رہی ہے، شلاً مصر، طرابلس، مراکش، شام، عرب، فلسطین، عراق اور افغانستان جہاں کے مسلمانوں کو یہ فائدہ حاصل ہے کہ ان کے ممالک میں اجتماعی زندگی یکساں اور ہم رنگ ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ ہم ایک وسیع رقبہ پر پھیلے ہوئے ہیں اور ہمکو ایک غیر مسلم اکثریت کے درمیان زندگی بسر کرنی پڑتی ہے، پھر بھی ہم میں یہ شعور روز بروز پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ دن دور نہیں جب کہ اسلام کا یہ عظیم الشان منطقہ جو بحر اٹلانٹک کے سواحل سے چلکر دو بڑی اقلیموں پر پھیلا ہوا ہے اور جس کی شاخیں جگہ جگہ دونوں طرف نکلی ہوئی ہیں حرکت کرنے والی

معقول میں اسی اسپرٹ کے ساتھ آن شامل ہوگا جس کو لوگ دور سائنس کی اسپرٹ کہتے ہیں۔ پس اسلامی تہذیب اس قسم کی تہذیب نہیں ہے جو کسی ایسی تہذیب سے متصادم ہوتی ہو جو سائنس کی اساس پر وجود میں آئے۔ یقیناً وہ اس سے اُبھر آئے گی نہیں اس میں زندگی کی وہ قوت موجود ہے جس سے وہ اپنے آپ کو عالم وجود کے متغیر حالات کے ساتھ ہم رنگ وہم آہنگ بنا سکتی ہے اگر اس سے صحیح طور پر کام لیا جائے تو وہ اس ملک میں بھی زندگی کو پستیوں سے اٹھانے کے لیے ایک بیش بہا سرمایہ ثابت ہوگی۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد کا یہ ایک جز ہے اب اس کے دوسرے جز کو لیجیے۔

وحدت کی تہذیب یعنی شریعت | آپ کو یاد ہوگا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ "حرکت فی الحیات" کا مقصود "وحدت فی الحیات" ہے اور یہ دونوں چیزیں مل جل کر ان تمام مساعی اور عملی سرگرمیوں کی اساس بن جاتی ہیں جو مسلمان اپنی زندگی میں کرتا ہے۔ درحقیقت "وحدت فی الحیات" کا قانون اسلام کا روحانی اور اخلاقی قانون ہے۔ ایک ایسا قانون جس پر مدنیت اسلام کی اجتماعی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے اور جس کو منضبط کرنے کے لیے "شریعت" کے نام سے ایک ضابطۂ عمل مدون کیا گیا ہے۔ میں زندگی کے اس روحانی قانون کی تشریح و توضیح کرنا چاہتا ہوں جو اس "شریعت" کی تہ میں کارفرما ہے، یعنی قانون وحدت جس سے الگ ہو کر "حرکت فی الحیات" فساد اور تباہی کی موجب بن جاتی ہے۔ اسلامی تہذیب جو اپنے اندر یہ قانون رکھتی ہے سائنس کے ہر کارنامہ کا خیر مقدم کرنے پر تو آمادہ نظر آئے گی لیکن غور کے ساتھ وہ یہ دیکھے گی کہ آیا یہ کارنامے وحدت فی الحیات کے لیے کارآمد یا اس کی ترقی میں مددگار ہیں یا نہیں؟ جہاں اس قسم کا افادہ نہ ہو وہاں اسلامی ذہن سائنس کے اس کارنامے کو ایک جزو حیات کی حیثیت سے قبول کرنے پر مائل نہ ہوگا۔ اگر ہمارے ذہن کی اس خصوصیت کو وہ لوگ سمجھ جائیں جو دنیاوی امور میں ہم سے اشتراک عمل کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے

روزمرہ کے تعلقات درست کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ وہ چیز جس میں ہم رد و قبول کی بنیاد پر کوئی مصالحت (Compromise) نہیں کر سکتے اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ وہ زندگی کی تمام مساعی کا وہ اخلاقی سانچہ اور اخلاقی ڈھنگ ہے۔ جو اسلام نے اپنے پیرؤوں پر لازم کر دیا ہے۔ اگر لوگ پیٹ اور اس کے مطالبات کی بنیاد پر کوئی مسلک اختیار کریں گے اور یہ چاہیں گے کہ مسلمان زندگی کے اس اخلاقی پہلو سے بے پرواہ ہو کر اس مسلک کو قبول کر لیں تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ انھیں اس میں ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ اخلاقی اساس کیا ہے؟ میں اسلام کے بنیادی عقیدے یعنے توحید الٰہی کی تشریح میں آپ کا وقت لینا نہیں چاہتا۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہاں مجھے صرف اجتماعی و عمرانی معاملات میں اس عقیدے کے اثرات سے سروکار ہے۔ ہمارے نزدیک توحید الٰہی اپنا اثر توحید انسانی میں ظاہر کرتی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں نوع انسانی ایسے افراد سے مرکب ہے جو مساوی روحانی مرتبہ لیکر پیدا ہوتے ہیں۔ ہر انسانی روح ایک ہی جوہر سے بنتی ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم ہے۔ کسی شخص کی روح پیدائشی داغدار نہیں ہے اور نہ اس کو کسی ایسے گناہ کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے جو خود اس سے کسی پہلے جنم میں یا اس کے کسی مُورثِ بعید سے صادر رہا ہو۔ وہ خود اپنے عمل کے سوا کسی چیز کا ذمہ دار نہیں۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے۔ جہاں سے زندگی اور مدنیت کا اسلامی تصور شروع ہوتا ہے۔ خدا کی نظر میں ہم سب مساوی ہیں۔ یہاں مرد و زن میں کوئی فرق نہیں۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے ہم سب ملکر ایک خاندان کو تشکیل دیتے ہیں جو خدا کا کنبہ "عیال اللہ" ہے۔ جب قرآن آنحضرت پر نازل ہوا تو انسانی جماعت کا نظام دنیا کے ہر گوشہ میں خواہ وہ عرب ہو یا ہندوستان، ایران ہو یا سلطنت روما، نسبی امتیازات اور تقسیم طبقات کی بنیاد پر قائم تھا۔ جب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) انسانیت کی مدد کے لیے آئے اور

اپنا پیغام، مساوات اور عقلی و اجتماعی آزادی کا پیغام سنایا تو ہر اس برہان کا قلع قمع ہوگیا جو اس بنیاد کی حامی تھی ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان برابری کا احساس مسلمان کے ذہن میں گہرا جما ہوا ہے اور میں ہر نقادسے کہہ سکتا ہوں کہ یہ احساس نہ عربی الاصل ہے، نہ ایران میں آپ اس کی جڑ کا پتہ لگا سکتے ہیں اور ہندوستانی تمدن کی پیداوار تو یہ بہرحال نہیں ہے۔ آپ جہاں بھی مسلمانوں کو ملتے دیکھیں گے خواہ دن میں پانچ دفعہ مسجد میں یا سال میں ایک دفعہ کعبۃ اللہ میں، وہیں آپ کو مسلمانوں کی تہذیب نظر آجائے گی۔ یہ برابری کا احساس، یہ بلالحاظ رنگ و نسل و مرتبہ کھوے سے کھوا ملا کر کھڑے ہونا، یہ ایک مالک اکمل آقائے کائنات کے سامنے ایک مشترک عبادت میں ساتھ اٹھنا، ساتھ جھکنا، ساتھ بیٹھنا، یہ اظہار عبودیت کے لیے ایک ہی مشترک زبان استعمال کرنا، ایک ہی تمنا ظاہر کرنا، یہی احساس مساوات اور یہی اس کا ظہور مسلمانوں کی تہذیب ہے۔ یہ ہندوستان میں بھی اسی طرح مل جائیگی جس طرح دنیا کے ہر گوشہ میں جہاں دو مسلمان ملیں

اسلامی زندگی میں تہذیبی منازل | اشین اور سائنس کے اس دور میں بھی ولادت سے موت تک ایک مسلمان کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ وہ کونسے تہذیبی منازل ہیں جن سے اس کو گزرنا پڑتا ہے قطع نظر اس کے کہ وہ انفرادی طور پر ان کے اثرات کس طرح قبول کرتا ہے؟ یہ ایک راستہ ہے مسلمان کے قلب تک رسائی حاصل کرنے کا۔ ایک یقینی ذریعہ ہے اس کی تہذیب کو سمجھنے کا۔

جونہی کہ ایک مسلمان کے گھر بچہ پیدا ہوتا ہے ایک آواز اس کے کانوں میں پہنچتی ہے۔ یہ اس کا اصطباغ ہے۔ اس کو پانی سے اصطباغ نہیں دیا جاتا بلکہ خود اسکی اپنی فطرت کے جوہر سے دیا جاتا ہے یہ آواز بالعموم باپ یا کسی بزرگ خاندان کی ہوتی ہے۔ یہ اس کو ایک پیام پہنچاتی ہے جو اس کی اپنی فطرت کا پیام ہوتا ہے:-

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔"

جیسا کہ خود رسول اللہ نے فرمایا یہ آواز آزادی کا اور عظمت انسانی کا پیغام دیتی ہے وہی آواز پھر کہتی ہے "نیکی کے راستہ پر آؤ۔ بہبودی کے راستہ پر آؤ"۔

یہ آواز تکرار کے ساتھ بچہ کے اُس مشن کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے اس کو اپنی زندگی میں پورا کرنا ہے اور اُس کو وہ راستہ دکھاتی ہے جس پر اسے بلندترین نصب العین کی خدمت میں اپنی تمام قوتوں کو وقف کردینا چاہیے۔ اس کے بعد یہ آواز اُنہی بولوں پر ختم ہوجاتی ہے جن سے وہ شروع ہوئی تھی۔

"اللہ سب سے بڑا ہے۔ اس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں"۔

یہ چھوٹی سی سادہ رسم جو ایک نوزائیدہ بچے کے لیے ادا کیجاتی ہے، حالانکہ اس وقت وہ اپنے گردوپیش کی کسی چیز سے آشنا نہیں ہوتا، یہ اسلامی تہذیب کی ایک زبردست معنی خیز نشانی ہے اور اس چیز کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اسے آگے چل کر آزادی اور وحدت فی الحیات کی تہذیب کا احترام کرنا اور اسی کی پیروی کرنا ہے۔ یہ مختصر سی پکار جو پیدا ہوتے ہی بچہ کو سنائی جاتی ہے بس اسی رسم کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی بلکہ زندگی بھر اس کے ساتھ لگی رہتی ہے۔ صبح آنکھ کھلتے ہی اور رات کو آنکھ بند کرنے سے پہلے وہ یہی پکار سنتا ہے۔ اور دن میں تین مرتبہ مکرر اس کے کانوں سے وہ آواز ٹکراتی ہے جو موذن اپنے منارہ سے بلند کرتا ہے۔ ہر بار یہ صدا اس کو وہی پیغام یاد دلاتی ہے جو پیدایش کے وقت اس کے سامنے میں اتارا گیا تھا یعنی فلاح اور عبودیت الٰہی کی دعوت کا پیغام۔

درحقیقت اس تہذیب کی روحانی حیثیت ایسی ہے کہ جب زمین پر اس کی زندگی کا کام پورا ہوچکتا ہے اور اس کے اقارب اور احباب خدا حافظ کہنے کے لیے اس کے گرد جمع ہوتے ہیں تو وہی آواز پھر اس کے جسم پر سے گذرتی ہے اور یہ مجمع ایک صف میں دوش بدوش استادہ ہوکر اس کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے۔ موت کے بعد بھی یہ آواز پھر اسی ترقی، اسی فلاح، اسی عبودیت الٰہی کی طرف بلاتی

ہے، کیونکہ موت اسلام میں اس چیز کا نام ہے جو ایک دوسرے بلند تر عالم میں زندگی کے ایک نئے باب کا افتتاح ہے۔ پھر دیکھیے۔ مرنے کے بعد بھی وہ قبر میں جس انداز سے لیٹتا ہے وہ اس کی تہذیب کا ایک نشان ہے۔ وہ لیٹتا ہے، مسالوں میں لپٹا ہوا نہیں مستحکم تابوت میں محفوظ نہیں، بلکہ اس طرح کہ مٹی، مٹی سے ہم آغوش ہوتی ہے، اتنی ہی محدود جگہ میں جو دنیا کے ہر مسلمان کو برابری کے ساتھ ملتی ہے۔ اور یہاں دنیوی زندگی کی اس آخری منزل میں بھی اس کا منہ ایک ہی مشترک مرکز کی طرف پھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہے مسلمان کی تہذیب۔ وہ ایک سادہ لباس میں لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ وہی چادریں جن کو اوڑھے ہوئے کبھی وہ اپنے رفقاء کے ساتھ میدان عرفات میں نظر آیا تھا، تاکہ سب ایک ایسے ہی سادہ لباس میں اسی ایک مشترک مرکز پر زندگی کے ایک ہی مشترک نصب العین کے لیے وفاداری کا اقرار کریں۔ یہ لباس اس کی تہذیب کا نشان ہے۔ ترکی ٹوپی نہیں پاجامہ نہیں۔ کوئی اور چیز بھی نہیں جس کو وہ وقت اور حالت کے لحاظ سے حسب ضرورت پہن بھی سکتا ہے اور اتار بھی سکتا ہے۔

ایک مسلمان کی زندگی میں ولادت اور موت کے ان دو مرحلوں کے درمیان بہت سے مرحلے ہیں جن کی تشریح کے لیے میرے پاس کافی وقت نہیں۔ مگر ان دونوں مرحلوں کے درمیان اس کو جو کچھ کرنا ہے اسے اجمال یا تفصیل کے ساتھ اس کی کتاب مقدس میں درج کر دیا گیا ہے۔ اور اس کتاب کی ہدایات کسی نہ کسی صورت میں بچپن سے لے کر آخر عمر تک ہمیشہ اس کے سامنے رہتی ہیں۔ یہی ہدایات اور ان کی وہ عملی صورت جو رسول کی سیرت پیش کرتی ہے، مسلمان کی شریعت پر مشتمل ہیں۔ اس کی خصوصیات کو اجمالی طور پر ذہن نشین کرنے کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ: اولاً وہ مسلمانوں کی عبادت کے ضوابط مقرر کرتی ہے۔ ثانیاً وہ اُن فرائض کا تعین کرتی ہے جو ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے حق میں ادا کرنے پڑتے ہیں چاہے وہ خاندان کے دائرے میں ہوں یا اس کے باہر۔ اور اس کے ساتھ وہ ان فرائض کی بھی تفصیل کرتی ہے جو مسلمانوں کو اُن غیر مسلموں کے حق میں ادا کرنے پڑتے ہیں جو ان کے نظام حکومت کا جز ہوں۔ نیز ان سب کے

حق میں سلطنت کے جو فرائض ہیں انھیں معین کردیتی ہے ۔ آخر میں وہ معاشی خود اکتفائی کا ایک لازمی نظام عمل مرتب کرتی ہے جس کی رو سے ہر وارث کو خواہ مرد ہو یا عورت وراثت میں منصفانہ حصہ مل جاتا ہے اور غریبوں کو سہارا دینے کے لیے، خصوصاً بیوہ، یتیم، ضعیف العمر اور کمزوری پرورش کے لیے امیروں کی زائد دولت پر ایک خاص ٹیکس عائد ہوتا ہے ۔ یہ خاص خاص امور ہیں جن کی طرف شریعت خبر توجہ کرتی ہے ۔ اگرچہ ان کے علاوہ بھی بہت سے مسائل ہیں مثلاً پاکیزگی جسم و اخلاق، اکل و شرب، لباس، عادات، معاشرت وغیرہ جن میں وہ رہنمائی کرتی ہے ۔ ہدایت کے اس مجموعہ یا شریعت کا مقصد دراصل ایک ایسی مدنیت کو نمو دینا تھا جو اپنی کارگاہ عمل میں زندگی کی مادی اور روحانی قوتوں کی ہم آہنگی کا مظہر بن سکے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف اس نے ہر قسم کی مادی ترقی کے لیے سعی و عمل کی پوری آزادی دے دی اور دوسری طرف ایسے حدود مقرر کر دیے جو اس سعی و عمل کو اتنا نہ بڑھنے دیں کہ وہ سوسائٹی کے کسی دوسرے رکن کی اخلاقی یا مادی فلاح و بہبود پر دست برد کرنے لگے ۔ اسی لیے وہ ان فرائض پر زیادہ زور دیتی ہے جو دوسروں کے لیے انسان کو ادا کرنے چاہییں اور کسی ایسے حق کی تائید نہیں کرتی، جس کا مطالبہ فرائض سے بے تعلق ہو کر کیا جائے ۔ اس قانون کے بعض احکام کی تعبیروں میں اختلاف ہوا ہے اور اسی اختلاف نے مسلمانوں میں متعدد مذاہب ((Shcools) پیدا کیے ہیں لیکن اصول دین میں ان کے درمیان بہت ہی کم اختلاف ہے ۔

یہ شریعت یا قانون اسلام ایک تہذیبی مظہر ہے ذہن اسلامی کا اور مسلمانان ہند کی زندگی میں اب بھی ایک زندہ قوت کی طرح کارفرما ہے جس طرح کہ وہ دوسرے اسلامی ممالک میں ہے ۔ اس لیے کہ اس کا مقصد ہی مسلمان کے روزمرہ افعال و اعمال پر حکومت کرنا ہے ۔ تاریخ اسلام گواہ ہے کہ جب تک نفس مسلم میں حرکت و حدت کے اس قانون کی روح کارفرما رہی جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت تک یہ شریعت نئے حالات کے مطالبات کا جواب دیتی رہی اور تمدن کو ترقی دینے کے لیے مسلمانوں میں تازہ

روح پھونکتی رہی۔ اس حرکت کی روح نے جس چیز کے ذریعہ سے اپنا کام کیا ہے اس کا نام اجتہاد ہے بدقسمتی سے اجتہاد کی روح چند صدیوں سے ہم میں خوابیدہ پڑی ہوئی ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی رفتار زمانہ سے الگ ہوگئی ہے پستی اور اسلام فراموشی کی ان صدیوں پر پلٹ کر دیکھنا اور اس کے اسباب پر واویلا مچانا بے سود ہے۔ یہ "شریعت اسلام" تقریباً ایک جامد صورت میں ہم تک پہنچتی ہے اور وہ بھی ایسے وقت جب کہ ہماری اپنی کوئی مرکزی تنظیم موجود نہیں جس کے ذریعہ سے ہم اس ملک میں اپنی روزمرہ زندگی کو منضبط کرنے کے لیے وہ اختیارات استعمال کرسکیں جو ضابطۂ شرعی ہم کو دیتا ہے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب جس کی اصلی شان شریعت ہی کے نفاذ سے ظاہر ہوسکتی ہے، آج اس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، بلکہ اس کے وجود ہی سے انکار کیا جارہا ہے، مگر میں پھر بھی یہ عرض کروں گا کہ اس موجودہ صورت میں بھی اس نے اپنی وہ خصوصیات کھو نہیں دی ہیں جو مسلمانوں کے ذہن میں ان کی قومی وحدت اور اس اخلاقی اساس کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گی جس پر ان کے نظام اجتماعی کی عمارت قائم ہے۔ ان کا طریقۂ عبادت جو ان کو ایک دوسرے سے جوڑنے والی سب سے بڑی قوت ہے آج بھی اسی شکل میں موجود ہے جس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو مقرر کیا تھا مسجد کا رخ آج بھی اسی سمت پر ہے اور وہ پکار جو اس کے منارے سے بلند ہوتی ہے وہی پرانی زبردست پکار ہے جس نے کسی زمانہ میں مسلمانوں کے اندر حرکت کی عجیب روح پھونک دی تھی۔ صنفی تعلقات میں، زندگی کے روزمرہ معاملات میں وہی اخلاقی معیار آج بھی مسلّم ہے خواہ افراد اس کی عملاً پابندی کریں یا نہ کریں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن زندہ ہے اور اب وہ ترجموں کے ذریعہ سے حرکت، وحدت، آزادی اور مساوات کا پیام ہر گھر میں پہنچا رہا ہے۔

نہضت جدیدہ اس طرح وہ تمام خصوصیات جو اسلامی تہذیب کی مابہ الامتیاز ہیں سب کی سب محفوظ ہیں۔ صرف ان کے مادّی سہاروں کو ساتھ لگانے کی ضرورت ہے۔ گذشتہ چند قرنوں کے واقعات نے

ساری اسلامی دنیا میں اپنی مادی زندگی کی پستی کا احساس پیدا کر دیا ہے۔ ہر جگہ کے مسلمانوں میں اور مسلمانان ہند میں بھی بیداری کی علامتیں اور قوی علامتیں پائی جارہی ہیں۔ یہ وہی بیداری ہے جو بالعموم ان گری ہوی قوموں میں پیدا ہوتی ہے جن کا ماضی شاندار رہا ہے۔ اب غیر مسلم قوموں کو کسی جگہ ایک انحطاط پذیر جماعت سے واسطہ نہ پڑے گا جیسی کہ اب تک مسلم جماعت رہی ہے بلکہ ایک ترقی پذیر نسل سے سابقہ پیش آئے گا جس میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اپنے مذہب سے غفلت برتنے یا اس کا صحیح اتباع نہ کرنے ہی کی وجہ سے اس زدہ حالت کو پہنچی ہے۔ اب یہ نسل اپنے مرتبہ کی بازیابی کے لیے آگے بڑھے گی اور صرف اپنی گذشتہ تہذیب کا ورثہ ہی نہ طلب کریگی بلکہ اس قوت حیات کو پھر سے تازہ کرے گی جو اس کے مذہب میں موجود ہے۔ یہ حیات نو کونسی شکل اختیار کرے گی؟ اس کا تعین اس آزادیٔ عمل سے ہو گا جو ان لوگوں کو حاصل ہو گی۔ جہاں وہ برسر اقتدار ہوں گے یا جہاں اجتماعی ماحول خالص اسلامی ہو گا وہاں تو ان کا راستہ بالکل صاف ہے۔ وہ اٹھینگے تو اپنے بل پر اور گریں گے تو اپنے بل پر۔ مگر جہاں مثلاً ہندوستان میں وہ ایک تکونی (Triangular) زندگی بسر کرنے پر مجبور رہیں وہاں ان کو بر سبیل تنزل مصالحت (Compromise) کرنی پڑے گی۔ مختلف تہذیبوں کو مخلوط کرنے کا تخیل تو ایک خام خیال ہے ہندوستان میں تہذیبوں کا وفاق (A federation of cultures) ہی ایک دانشمندانہ حل ہے اور اسی منتہا کی طرف تمام کوششوں کو راجع کرنا چاہیے۔ یہ ایسا وقت نہیں ہے کہ مسلمانوں کے لیڈر چھوٹی چھوٹی ہنگامی اور خود بخود مر جانے والی چیزوں پر اصرار کریں۔ ان کو اپنی تمام قوتیں ان اہم تر مسائل پر مرتکز کرنی چاہئیں جو ہندوستان میں ان کی تہذیب کے مستقبل سے تعلق رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ شریعت کے اس پہلو کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے جس کے علمی اور معاشی اصولوں کو نہ سمجھنے اور ان سے غفلت کرنے کی بدولت ہی مسلمان اس حال کو پہنچے ہیں۔

اب ایسا بندوبست ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسل معاشی حیثیت سے خود اپنے پاؤں کھڑی ہو اور علمی اور سیاسی حیثیت سے اتنی محفوظ ہو کہ اس کو ناجائز طور پر استعمال نہ کیا جا سکے۔

اسلام کا معاشی نظام العمل ہندوستان میں "شریعت" کے معاشی نظام العمل کے معطل ہو جانے کی بڑی وجہ یہ ہوی کہ ہماری تاریخ کے قریبی دور میں احکام اسلامی سے انحراف کی بہت زیادہ سہولتیں بہم پہنچ گئی تھیں لیکن اب کہ اس ملک کے ہر باشندے کے لیے حالات بہتری پر ہیں اور اہل ملک کو اپنی معاشی زندگی کی تنظیم جدید کے لیے اپنے معاملات خود اپنے ہاتھ میں لے لینے کا موقع مل رہا ہے مسلمانان ہند کے ہر بہی خواہ کو اولین فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ کہیں یہ جماعت جو صدمات زمانہ کے باوجود زندگی کے ایک بڑے اجتماعی نصب العین کے لیے جی رہی ہے، کسی خاص مذہب کے ستم پرستی کی شکار نہ ہو جائے۔ سب سے پہلے حکومت کی مشین کے ذریعہ سے اس کے داخلی وسائل معیشت کو شریعت کے مقرر کردہ اخلاقی طریقوں پر از سر نو منظم کر کے اس کی بھوک کا انتظام کر دینا ضروری ہے، اگر سندھ حکومت کو مسلمان اسی طرح اپنی حکومت کہنے کا حق رکھتا ہے جس طرح اس نظام سیاسی کے ہر دوسرے رکن کو حق ہے، تو اس کو اپنا پرسنل لا خود اپنے اوپر نافذ کرنے کا موقع اور اقتدار حاصل ہونا چاہیے۔ یہ سوال کہ اس نفاذ کی صورت اور اس کا انتظام کیا ہوگا اس کا تعلق تفصیلات سے ہے۔ باشندگان ملک کے غیر مسلم طبقوں کو اس تجویز میں حکومت کے اندر حکومت "کا ہوا" نظر آنے کی کوئی وجہ نہیں حکومت کے واسطہ سے مختلف طبقوں میں ان کے اپنے پرسنل لا کا نفاذ اس ملک میں کوئی نئی چیز نہیں ہے اور اگر اس کام کو بہتر طریقہ پر انجام دیا جائے تو اس میں کوئی نرالا پن نظر نہیں آسکتا۔ محض اپنے معاشی استقلال کی خاطر مملکت پر کوئی دباؤ ڈالے بغیر ایک ایسے سرکاری ادارہ کا مطالبہ کرنا مسلمانوں کا حق ہے جو مسلمانوں کے اوقاف کا انتظام کرے، زکوٰۃ اور دوسرے محاصل جو مسلمانوں کے فاضل مال پر شرعاً عائد ہوتے ہیں وصول اور تقسیم کرے اور وراثت اور ازدواج

اسکے قانون کو شریعت کی اصل روح کے مطابق نافذ کرے۔

روحانی زندگی اور اخلاقی معیارات | میں نے مسلمانوں کی معاشی ضروریات پر جو خاص توجہ مبذول کرائی ہے اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان ضروریات کی تکمیل ہی بذات خود کوئی مقصد ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ "شریعت اسلام" زندگی کے مادی پہلوؤں پر بھی اتنا ہی زور دیتی ہے جتنا اخلاقی و روحانی پہلوؤں پر، تاکہ ہماری روزمرہ زندگی میں روحانیت اور مادیت کے درمیان ایک فطری اور خوش آئند ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ روحانی پہلو کے تحفظ کو عام طور پر ایک انفرادی یا شخصی چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات ان جماعتوں کی حد تک صحیح ہو سکتی ہے جن میں روحانی ترقی کو اجتماعی سعی سے تعلق نہیں ہوتا۔ اسلام میں انفرادی روحانی ترقی بلاشبہ زندگی کا ایک مقصد ہے جیسا کہ ہر مذہب میں ہوا کرتا ہے، لیکن اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس انفرادی ترقی کو پوری امت کی روحانی ترقی پر اثر انداز کرنا چاہتا ہے جس سے مسلمانوں کے اتحاد و استحکام کی روح اور جملہ نوع انسانی کی وحدت کا جذبہ تحریک میں آئے۔ اسی بنا پر مسلمانوں نے ہمیشہ اس امر کو اہمیت دی ہے کہ ان کو ایک آزاد ماحول میں اپنی روزانہ نماز باجماعت ادا کرنے کی ضروری آزادی حاصل رہے۔ نماز باجماعت ہم میں ایک بڑی تہذیبی قوت ہے اور فطرۃً اس کو ہمارے تہذیبی تحفظات کے سب سے اہم امور میں شامل ہونا چاہیے۔ اسی طرح شریعت کی رو سے ہماری تمدنی و معاشرتی زندگی میں اخلاق کا جو معیار ہے اس کا احترام ہر اس قانون میں ملحوظ رکھا جانا چاہیے جو عام اہل ملک کی زندگی پر اثر ڈالنے والا ہو اور جس کے دائرہ میں مسلمان بھی آپ سے آپ آجاتے ہوں۔

تہذیبی انفرادیت | یہ ہے ان تہذیبی تحفظات کی نوعیت جن کو مسلمان اس نئی سیاسی زندگی میں اپنے لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں جس کا ہندوستان میں اس وقت آغاز ہوتا نظر آتا ہے۔ ہمارے غیر مسلم ہموطنوں کے لیے زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیں اور ان کا دلی اشتراک عمل

حاصل کرکے آگے بڑھیں۔ یہ گمان کر لینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا کہ اسلامی تہذیب اور ہندو اکثریت کی تہذیب میں بہت کم فرق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بہت سی سطحی چیزیں دونوں میں مشترک ہیں لیکن وہ زیادہ تر مشترک آب وہوا اور مشترک بازاری زندگی کی پیداوار ہیں۔ یہ ایسی چیزیں نہیں ہیں جو گھر کی معاشرتی زندگی کو ایک ہی قسم کا مرکب بنا سکتی ہوں۔ ان کی رسائی روح تک نہیں ہے۔ وہ دماغوں کو زندگی کے کسی مشترک اخلاقی تصور کے رشتہ میں منسلک نہیں کرسکتیں نہ مساوات کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ کسی مقدس تعلق کا مشترک احساس پیدا کرسکتی ہیں۔ اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے میں دوسرے لوگوں کی تہذیب کا تجزیہ نہیں کرنا چاہتا۔ ہوسکتا ہے کہ دونوں تہذیبوں کی نوعیت میں بنیادی اختلافات کا پایا جانا ایک بدقسمتی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مرورِ زمانہ سے کوئی اساسی ہم رنگی آگے چل کر پیدا ہو جائے لیکن جب تک اختلاف باقی ہے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلامی تہذیب کو تحفظ کی ضرورت نہیں ہے یا نہ ہونی چاہیے؟ خصوصاً جب کہ یہ تہذیب زندگی کے ایک ایسے عالمگیر روحانی قانون پر مبنی ہے جو نوعِ انسانی کی تفریق کے لیے نہیں بلکہ وحدت کے لیے گرم کار ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جمہوری ممالک میں بھی ایسی اعلیٰ تہذیبیں جو اقلیتوں کی زندگی کا مظہر تھیں کس طرح بزورِ شمشیر یا اکثریت کے استبدادی طرزِ عمل سے مٹ گئیں۔ ہندوستان کا مسلمان اس قسم کے امکان کو روکنے کا ارادہ رکھتا ہے جہاں تک بھی اس کا بس چلے۔

یکساں ترقی یہی وجہ ہے کہ مسلمان اس اقتدار میں حصہ لینا چاہتا ہے جو حکومت کی مشین کو قابو میں رکھتا ہے۔ اسی طرح وہ ملک کی ثروت میں بھی کافی حصہ کا طالب ہے۔ وہ ترقی ہی کیا جو اسے ایک طرف اتنی قوت نہ بخشے کہ وہ خود اپنی اور ہر اس چیز کی جسے تہذیبی نقطۂ نظر سے وہ عزیز رکھتا ہے زمانہ کے تلوّنات سے حفاظت کرسکے اور دوسری طرف اس کو ملک کی عام ترقی میں حصہ لینے کے ذرائع و وسائل مہیا نہ کرے۔ مسلمان اکثر صوبوں میں زمین کی ملکیت سے قریب قریب محروم ہیں۔ ملک کی

صنعتی و تجارتی زندگی میں بھی ان کا بہت کم حصہ ہے۔ اس کے ساتھ وہ تعلیمی حیثیت سے بھی ابھی تک پسماندہ ہیں اور ہمیشہ ساہوکار کے پھندے میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہ رکاوٹیں اور کمزوریاں ہیں جنکی وجہ سے ترقی کی راہ میں ان کی رفتار سست ہے اور ان کو دیکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے عوام کو پستی سے اٹھانے کے لیے معاشی اصلاح کا جو لائحۂ عمل اس وقت پیش کیا گیا ہے وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے۔ اگر ملک کے تمام طبقوں کو ابھار کر ایک سطح پر لانا فی الواقع مقصود ہے تو مسلمانوں کے حال پر اس سے زیادہ توجہ کرنی پڑے گی۔ یہ اصلی محک امتحان ہے قومیت یا سیاسی حصہ داری کا، اگر اس چیز کو پائیدار اور ترقی پذیر بنانا ہے۔ آپ قومیت کے خوش آئند ترانہ کو ایک ایسا طوفان بننے کی اجازت نہیں دے سکتے جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کمزور پودوں کو جڑ سے اکھاڑتا چلا جائے۔ ہمکو دعا کرنی چاہیے اور امید رکھنی چاہیے کہ ہر جگہ عقل سلیم کا بول بالا ہو اور مسائل وطنی کا ایک اچھا حل تلاش کیا جائے۔ کیونکہ میرے خیال میں اسی پر ہندوستان کے مستقبل کی بہتری منحصر ہے۔ اگر ہمارے ہم وطن مقتضیات وقت کے مطابق بن جائیں اور "فرقہ پرستی" کا شور مچانا کم کر دیں، تو وہ دیکھ لیں گے کہ اخلاقی و روحانی استعداد کے لحاظ سے ہندوستان کا کوئی طبقہ اتنا تیار نہیں ہے جو ہندوستان کو دنیا میں عزت کے مقام پر پہنچانے کے لیے مسلمانوں سے بڑھ کر اقدامِ عمل کی ذمہ داری سنبھال سکتا ہو۔

اردو کا مسئلہ "شریعت" کے تہذیبی تحفظات کے علاوہ تہذیب کا ایک اور شعبہ بھی ہے جسمیں ہندوستان کا مسلمان اپنے حصہ کو جدید تقسیم میں محفوظ کرانے کے لیے اتنا ہی بےچین ہے۔ وہ علم و ادب کا شعبہ ہے اور اس میں مسلمان چاہتا ہے کہ اس زبان کے فطری نشو و نما میں کوئی رکاوٹ نہ ہو جس کو دوسروں کے ساتھ ملکر اس کی کوششوں نے اتنی ترقی دی ہے کہ وہ نہ صرف اس کی تہذیب کے اظہار کا ایک ذریعہ اور مسلمان کی وحدت کا ایک واسطہ بن گئی ہے بلکہ ہندوستان کے دوسرے

طبقوں سے بھی ایک زندہ رابطہ قائم رکھنے کا وسیلہ ہے۔ یہ بذات خود ایک اہم مسئلہ ہے کیونکہ زبان جس میدان میں اپنی جولانی دکھاتی ہے اس کی سرحدیں تہذیب کے ہر دوسرے شعبہ سے ملی ہوئی ہیں اور اس بنا پر ضرورت ہے کہ اسکی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی جائے۔ ممکن ہے کسی اور موقع پر میں زیادہ تفصیل سے اس پر بحث کر دوں۔ مگر اس موقع پر بھی میں اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں کہ اُس رجحان کے خلاف آواز بلند کروں جو خود میرے اپنے ادبی دوستوں میں بھی پیدا ہو گیا ہے کہ محض ارباب سیاست سے مصالحت کی خاطر اردو زبان کو ہندوستانی یا ہندی ہندوستانی کا مبہم سا نام دیا جائے۔ میرے خیال میں یہ روش نہ عالمانہ ہے اور نہ بے لاگ۔ مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس زبان کو اس کے اصلی نام "اردو" کے بجائے کسی دوسرے نام سے یاد کیا جائے۔ یہ وہ نام ہے جو خود اس کے ماں باپ نے رکھا ہے اور ہمیں اس کو بدلنے کا کوئی حق نہیں۔ وراثت کا ایک حقدار چاہے تو اپنے حق سے دست بردار ہو کر اپنے الگ راستہ پر جا سکتا ہے۔ مگر دوسرا حقدار کیوں اس کی پیروی کرے؟ بلاشبہ مسلمان اس بات پر رنج محسوس کریگا کہ اس کے ہموطن دو عظیم الشان تہذیبوں کے باہمی رشتۂ اتحاد کو توڑنے کے لیے اس شدت کے ساتھ کوشش کریں جیسی کہ وہ کر رہے ہیں اور اپنے لیے ایک الگ راستہ بنائیں جیسا کہ وہ بنا رہے ہیں۔ ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی فی الحقیقت کوئی ضرورت نہ تھی۔ اردو زبان جو ہندو اور مسلمان دونوں کی ذہانت کا مظہر ہے آج آتنی کافی قوت رکھتی ہے کہ دونوں فرقوں کے تہذیبی افکار اس میں سما سکتے ہیں۔ وہ ہر زبان کے لیے کافی شیریں ہے۔ لیکن ہمارے دوست اس وقت سننے کی موڈ میں نہیں ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ نئی زبانیں اس طرح نہیں بنائی جاتیں اور زندگی کے فطری قوانین سیاسی نعروں سے زیادہ طاقتور ہیں۔ اس لیے مسلمان ان کے الگ ہو جانے سے پریشان نہیں ہے بلکہ اس کی پریشانی ایک اور چیز پر مبنی ہے جو زیادہ اندیشناک ہے۔ اسے خوف ہے کہ یہ لوگ ایک مصنوعی بانگ (جو اپنی ساخت اور معنویت کے اعتبار سے مسلمانوں کے لیے بالکل یہ ایک اجنبی زبان ہے) پیدا کرنے اور تمام

ملک پر مسلط کر دینے کے جوش میں اردو زبان کی مزید ترقی کے راستہ میں رکاوٹیں ڈالیں گے۔ دراصل یہی وہ خطرہ ہے جس سے اردو زبان کو محفوظ کرنے کی فکر اُسے لاحق ہے۔ اُس نے ان لوگوں کو حجت سے قائل کرنے کی کوشش کی کہ اردو زبان پہلے ہی سے ہندوستان کے لیے ایک مشترک زبان کا کام دے رہی ہے، اب اسی غرض کے لیے ایک نئی زبان پیدا کرنا تاکہ وہ اردو کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لے، یہ نیا اقدام پرلے درجہ کی فرقہ پرستی اور ہندوستان میں قومیت کے مفاد کے ساتھ کھلی دشمنی ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ملتا ہے (میں پنڈت جواہر لال نہرو ہی کا قول نقل کر رہا ہوں) کہ:-

اکثریت کی فرقہ پرستی بہ نسبت اقلیت کی فرقہ پرستی کے قوم پرستی سے قریب تر ہے"۔

اس قسم کا ہے وہ تحت الشعور جو ہماری پبلک زندگی میں قوم پروری کے نام سے کار فرما ہے! اس کے بعد واقعہ یہ ہے کہ بحث کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ میری مخلصانہ رائے یہ ہے کہ مسلمان کو اس بات پر متردد نہ ہونا چاہیے کہ دوسرے لوگ ایک مصنوعی زبان کو اس ملک میں رائج کرنے کیلیے کیا کر رہے ہیں۔ ہر مصنوعی زبان کی طرح اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس کے پیشروؤں کا ہوا۔ البتہ خود مسلمان کو چاہیے کہ اردو کو ان بہترین چیزوں سے مالا مال کرتا رہے جو اس کا ذہن مہیا کر سکتا ہے تاکہ وہ اپنے فطری راستہ پر ترقی کرے۔ اس کے ساتھ دوسروں کے لیے دروازہ بھی کھلا رکھنا چاہیے کیونکہ صرف یہی ایک زبان ہے جو ایک دن سارے ہندوستان کو متحد کر کے رہے گی۔ اس کی جگہ لینے والی کوئی اور زبان نہیں۔ پس مسلمان کو چاہیے کہ دروازہ کھلا رکھے اور مکان کو آرام دہ بنائے۔ مجھے یقین ہے کہ آوارہ بھائی ایک دن بھٹک بھٹکا کر پھر پلٹ آئیگا اور اپنا حصہ طلب کرے گا۔ مگر مسلمان کو اس کے طریقہ کی پیروی نہ کرنی چاہیے کہ خود رجعت پسند بن جائے۔ واقعہ حقیقت یہ ہے، جیسا کہ میں یقین رکھتا ہوں کہ، مسلمان اس وقت اگر رجعت پسند بننا بھی چاہیں تو نہیں بن سکتے۔ ان کی بڑی اکثریت کوئی دوسری زبان نہیں جانتی۔ کئی پشتوں سے وہ صرف اسی زبان کے ذریعہ اپنے علمی کام جیسے کچھ بھی وہ ہیں، چلا رہے ہیں۔ اب یہ ان کی مادری زبان بن گئی ہے اور

اسی وجہ سے ان کو عزیز ہے۔ اس میں ایسی صلاحیت پیدا ہوگئی ہے کہ ایک طرف اُن اسلامی افکار عالیہ کو جو ماضی سے ہم تک پہنچے ہیں، اپنی آغوش میں سنبھال سکتی ہے اور دوسری طرف ان خیالات کی بھی پرورش کرنے پر آمادہ ہے جو ہماری نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو سامنے نظر آ رہا ہے، ہمارے ذہن کی دنیا پر حکومت کریں گے۔ جس حد تک مسلمانوں نے اس زبان کے قالب میں اپنی روح پھونکی ہے اور جس حد تک انہوں نے اس میں اپنی قوت حیات منتقل کی ہے اُسی حد تک وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے کہ یہ زبان ان کی تہذیب کا بھی ایک مظہر ہے۔ اور ان کی یہ خواہش ہوگی کہ نہ صرف اس کے مفاد کی حفاظت کریں بلکہ اس کو ایک ایسا سہارا بنا دیں جس پر اہل وطن کے ساتھ ان کے باہمی ربط اور حسن تفاہم کی بنا قائم ہو سکے اور یہی چیز ہے جس پر ہندوستان کی دائمی فلاح منحصر ہے۔

خاتمۂ کلام دوستو! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ جس دلچسپی اور صبر سے آپ نے میری تقریر سنی ہے میں اس کے لیے آپ کا شکر گذار ہوں۔ میرے لیے باعث مسرت ہوگا اگر اسلامی تہذیب کے اس تجزیہ میں مجھکو کم از کم اتنی بات ہی آپ کے ذہن نشین کرنے میں کامیابی ہوئی ہو کہ مسلمانوں کی یہ تہذیب محض درزی کی دکان یا ڈرائینگ روم یا میوزک ہال کی تہذیب نہیں ہے۔ اور نہ یہ ایسی تہذیب ہے جس کے اجزاء خود آپس میں متزاحم ہوں، بلکہ یہ حرکت و وحدت فی الحیات کی تہذیب ہے اور اب بھی ہم میں پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہے۔ جب اس کی اصولی نوعیت یہ ہے تو کیا یہ کبھی کسی صحیح قومیت یا بین الاقوامیت یا کسی ایسے نصب العین کی مخالف ہو سکتی ہے جو انسان کے شایان شان ہو؟

مسلمان اور امامت کبریٰ

(۳)

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

باہمی عداوتیں | خلافت الٰہی کے قیام کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ دنیا کے تمام اختلافات اور اہواء و آراء کی تمام ہولناک بدعتوں کا خاتمہ کر دیا جائے، امت کے سارے افراد ایک اعلیٰ اور عادلانہ نظام کے ماتحت امن و سکون کی مسرت انگیز زندگی گزاریں، شیطان کی فساد انگیزیوں کے تمام منافذ بند کر دئے جائیں۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے بندوں پر اللہ ہی کا مقرر کردہ قانون حکومت کرے کیونکہ اس سے بڑھ کر کوئی مدبر نہیں، اس سے بڑھ کر کوئی حکیم نہیں، اس سے بڑھ کر احوال عباد کا کوئی علیم نہیں، اس کی نگاہ سے کوئی مصلحت او جھل نہیں رہ سکتی، عواقب اس سے مخفی نہیں، انسانی دماغوں کے بنائے ہوئے قوانین کی طرح اس کے احکام جانبداری، کوتاہ نظری اور انجام سے بے خبری پر مبنی نہیں ہوتے، اسی واسطے دنیا میں جو انسانی نظام بھی چلایا جاتا ہے وہ امن و انصاف سے بڑھ کر شر و فساد کا باعث ہوتا ہے، اور جب ایسا ہوتا ہے کہ دنیا خدا کے بنائے ہوئے اصول کو ترک کر دیتی اور اپنے ظن و تخمین کی تاریکیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے تو خدا کی رحمت نمودار ہوتی ہے، پیغمبر آتا ہے کہ کائنات ارضی پر فساد و فتن کے جو ہولناک شعلے بھڑک رہے ہیں انھیں رحمت الٰہی کے چھینٹوں سے سرد کر دے اور پھر ایسا ہو کہ خدا کی بادشاہت از سرِ نو قائم ہو جائے۔ چنانچہ دنیا کے آخری ہادی اور رحمۃ للعالمین کو یہی حکم ہوا تھا کہ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔

یہود و نصاریٰ کو بھی اسی لیے خلافت الٰہی کا تاج و تخت بخشا گیا تھا کہ وہ امن و سلامتی کے

علمبردار ہوں گے اور پوری امت میں احکام الٰہی کا نفاذ کرکے وحدت اور مساوات کی تخم ریزی کریں گے لیکن جب انہوں نے آئین سماوی کے تار و پود بکھیر کر رکھدئے، احکام شریعت کو تابوت سکنیہ میں رکھ کر محض تبرک و تیمن کا کام لینے لگے اور عبادات و سیاسیات اور اخلاق و معاملات غرض ہر ہر قدم پہ اپنے فہم و تدبر اور قوت قانون سازی پر بھروسہ کرنے لگے تو پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ انسانی خواہشات میں توافق کبتک قائم رہتا؟ آخر انسان کی فطری منافست نے رنگ دکھلایا اور قوم کی جمعیت پارہ پارہ ہوکر رہ گئی، بغض و عداوت کی آگ بھڑک اٹھی، بھائی کی چھری بھائی کی گردن پہ چلنے لگی امن و انصاف کے مدعیوں نے قتل و خونریزی اور فساد فی الارض کا بیڑا اٹھا لیا۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ تحریف کتاب، نقض میثاق اور احکام شرعیہ سے بے اعتنائی کی پاداش میں ان پر یہ لعنت مسلط کی گئی ہے جو ابدی اور سرمدی ہے، قیامت تک اس عذاب سے گلوخلاصی ممکن نہیں۔

وَمِنَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ أَخَذْنَا مِيثَاقَهُمْ فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔ (مائدہ ۳)

ان لوگوں سے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں ہم نے عہد لیا پھر انہوں نے اس چیز کا ایک حصہ بھلا دیا جس سے ان کو تذکیر کیگئی تھی پس ہم نے ان کے اندر عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی قیامت تک کیلیے۔

یہود کے متعلق فرمایا۔

وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ الآية (مائدہ ۹)۔

ان کے درمیان ہم نے بغض و عداوت کو ڈال دیا ہے قیامت تک کے واسطے۔

اس آیت کے بارے میں ارباب تاویل کا اختلاف ہے کہ آیا بغض و عداوت خود انھیں یہودیوں کے ابین ڈالدی گئی ہے یا مسلمانوں کے خلاف انھیں آمادۂ پیکار بنا دیا گیا ہے جیسا کہ

بعد میں اشارہ ہے۔ کُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۔ اگر دوسری تاویل مان لی جائے جب بھی نتیجہ وہی رہا یعنی فساد فی الارض اور حق سے علانیہ بغاوت۔ آج یہودیوں کی مسلمانوں کے ساتھ دشمنی عالم آشکارا ہے، رہ گئے نصاریٰ جن کے متعلق بالکل کھلے لفظوں میں پیشین گوئی موجود ہے، کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف قیامت تک سازشیں کرتے اور آپس میں کھنچے رہیں گے تو زمانہ سے بڑھ کر کوئی شاہد نہیں۔ عیسائی حکومتوں کی باہمی چپقلش کا ہیبتناک نظارہ کن نگاہوں سے مخفی ہے؟ کون حکومت ہے جو اپنے مفاد اور بہیمی خواہشات پر سارے نظام امن کو قربان نہیں کرنا چاہتی؟ کون ہے جو کسی رحمت و رافت کو قابل احترام سمجھ رہی ہے؟ کون ہے جو اپنی عیش پرستیوں کے لیے دوسروں کے منہ کی روٹی چھین نہیں لینا چاہتی؟ آئے دن قانون بنتے ہیں، معاہدے ہوتے ہیں، لیگیں قائم ہوتی ہیں، امن عالم کے خیالی وعظ ہوتے ہیں، دنیا میں سکون پیدا کرنے کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں، ظلم اور غضب کے خلاف محاذ قائم کیا جاتا ہے، لیکن جرمن ڈکٹیٹرشپ ہو یا برطانی دستوریت، اٹلی کی فسطائیت ہو یا فرانس کی جمہوریت، سب جنگ کا شرارہ ہیں جو ہر وقت امن عالم کو تباہ کر دینے اور پورے کرۂ ارض کو قتل و خونریزی کے ہولناک جہنم میں ڈھکیل دینے کے لیے تیار رہے۔ کیا یہ سب کچھ قرآن کی پیشین گوئیوں کے خلاف ہو رہا ہے؟ فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ ۔

اکل حرام زر پرستی یہود کی قومی خصوصیات کا سب سے نمایاں جوہر ہے۔ حتیٰ کہ ایک یہودی کے لیے چند روپیوں کے عوض انسانی جسم کا گوشت کاٹ لینا آسان تھا مگر چھوٹی سے چھوٹی رقم کا معاف کر دینا ممکن نہ تھا۔ سیم و زر کے چند ٹکڑوں پر دین و ایمان جیسی متاع عزیز کو قربان کر دینا ان کے لیے کھیل تھا۔ تحصیل مال ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اسی کیلیے وہ جیتے تھے اور اسی کے پیچھے مرتے تھے۔ مال و دولت ہاتھ آنا چاہیئے، خواہ حلال طریقہ سے ہو یا حرام طریقہ سے۔ جس وقت انھیں اس کی دھن سوار ہوتی اس وقت شرعی قیود تار عنکبوت سے زیادہ کمزور ہوتے۔ بیک جنبش ساری بیڑیاں ٹوٹ جاتیں

کور باطنی اور نفس پروری کی ایسی گھناؤنی تصویر صفحۂ کائنات کے کسی گوشہ میں نظر نہیں آسکتی جو ان کے مرقع زندگی میں ہمیں نظر آتی ہے۔ قرآن نے متعدد مقامات پر ان کی اس حرام خوری کی مذمت کی کی ہے، ایک جگہ ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (مائدہ ۶) وہ جھوٹ سننے کے خوگر ہیں اور ان کو حرام خوری کا سخت لپکا ہے۔

آگے چل کر پھر فرمایا۔

وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (مائدہ ۹) ان میں سے اکثر کو تم دیکھو گے کہ وہ گناہ اور سرکشی کی باتوں نیز حرام کھانے میں بڑی پھرتی دکھاتے ہیں، کیسا برا کام تھا جو یہ کرتے تھے۔

لیکن افسوس! اس مغضوب قوم کا ضمیر اس قدر فاسد ہو چکا تھا کہ ان کے رہنماؤں کے دلوں میں بھی ان منکرات کے خلاف کوئی ٹیس نہ اٹھتی کہ امت کو اس کھلی ہوئی گمراہی سے باز رکھنے کی کوشش کرتے۔ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ۔

یہی نہیں بلکہ ان علمبرداران ہدایت اور شاہدین حق و صداقت کا پیٹ عوام سے بھی کچھ زیادہ وسیع تھا۔ وہ بھی لوگوں کا مال شیر مادر سمجھکر بلا تکلف اڑاتے تھے، وہ تو ارباب من دون اللہ بنے بیٹھے تھے، نذروں کی بارش ہوا کرتی تھی، خلق خدا ان کو پوجتی اور وہ ان کی جیبوں کو پوجتے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان علماء سو نے دولت سمیٹنے میں حرام و حلال کی تمیز بھی اٹھا دی تھی حتی کہ اس کے لیے صد عن سبیل اللہ جیسے سیاہ جرموں کے ارتکاب سے باز نہ آتے:۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ اے ایمان والو بہت سے احبار اور رہبان لوگوں کا

اَلْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ مال غلط طریقہ سے (لوٹ لوٹ کر) کھاتے ہیں اور
بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (توبہ ۵) انھیں اللہ کی (روشن اور سیدھی) شاہ راہ سے باز رکھتے ہیں
ان زخارف دنیوی کے لیے مسجد اقصیٰ کی حرمت بھی بیچ ڈالی گئی تھی ہیکل سلیمانی ذکر و تسبیح کے
بجائے تجارت کا مرکز بن گیا تھا، حضرت مسیح نے انھیں ہنگاموں کو دیکھکر فرمایا تھا کہ اے فریسیو تم نے خداوند
خدا کے مقدس گھر کو لومڑیوں کا بھٹ بنا ڈالا ہے۔

موالات کفار و مشرکین اہل کتاب نے جب دین الٰہی کا دامن چھوڑ دیا اور وحدت ملی کو پارہ پارہ
کرکے دنیا طلبی اور دنیا سازی کے سامنے اپنی اپنی پیشانیاں ٹیک دیں اس وقت ان کی عداوت
کا معیار بدل جانا بھی ضروری تھا۔ وہ کسی کی طرف تعاون اور موالات کا ہاتھ بڑھاتے تو محض اتباع
شہوات کی بنا پر اور اگر کسی سے ترک موالات کرتے تو نفس کے اشارہ اور دنیوی مصالح کی رعایت پر۔
الحب فی اللہ و البغض فی اللہ کا ان کے نزدیک کوئی مفہوم نہ تھا وہ یہ بھول بیٹھے تھے کہ صرف
اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین ہی مومنوں کا طغرائے امتیاز ہے۔ قرآن کا فیصلہ تو یہ
ہے کہ دنیا میں کسی ایسی قوم کا وجود محال ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر صدق دل سے ایمان بھی لاتی
ہو اور پھر ان لوگوں سے ربط ضبط اور تعاون و موالات بھی رکھتی ہو جو خدا کے باغی اور نافرمان
ہیں۔ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ الآیہ (مجادلہ ۳) لیکن یہ ایمان باللہ کے مدعی اور
ایمان بالیوم الاخر کے صرف معتقد ہی نہ تھے بلکہ خدا کے محبوب اور لاڈلے بننے کا اور جنت کی
وراثت کا ببانگ دہل دعویٰ بھی کرتے تھے لیکن حال یہ تھا کہ خدا کے باغیوں اور نبی کے دشمنوں سے
علی الاعلان ان کا رشتہ ناتہ تھا۔
تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الآیہ (مائدہ ۱۱) تم دیکھتے ہو کہ انھیں سے اکثر کافروں کو اپنا ولی بنائے ہیں۔

آگے چل کر فرمایا کہ اگر یہ لوگ اللہ اس کے رسول اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتے ہوتے تو ہرگز کفار سے موالات نہ کرتے۔ گویا یہ چیز کفر و ایمان کی سرحد اور حق و باطل کی علامت فارقہ ہے لیکن قلوب پر جب شہوات کی تیرگی چھا جاتی ہے اور آنکھوں میں دنیا ہی دنیا سما جاتی ہے اس وقت حق و باطل کی تمیز ہی اٹھ جاتی ہے حق کی محبت اور باطل سے نفرت کا سوال ہی کب پیدا ہوتا ہے؟

تلاش حیل جب فطرت انسانی ہجوم شہوات کی وجہ سے زنگ آلود ہو جاتی ہے اور باطن خشیت الٰہی کے جوہر پاک سے خالی ہو جاتا ہے اس وقت انسان احکام فوقانی کو اپنے نفس کے بھینٹ چڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ کچھ کو تو بالکلیہ ترک کرنے پر مجبور رہتا ہے، بعض کو توڑ مروڑ کر موافق بناتا ہے، لیکن آخر میں اس کی قلبی شقاوت اور جسارت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ احکام الٰہی سے تمسخر کرنے لگتا ہے، احکام کے قالب سے شرعی روح نکال کر انھیں اپنی نفسانی خواہشات کا آلۂ کار بناتا ہے، عالم الغیب والشہادہ کو دھوکا دینا اور مخلوق کی آنکھوں میں خاک جھونکنا چاہتا ہے، مذہب کے نام پر مذہب کی روح کو اپنے نفس کی کند چھری سے ذبح کرتا ہے کتاب الٰہی حیلوں کا تختۂ مشق بن جاتی ہے۔

سبت کا دن یہودیوں کا مقدس اور متبرک دن تھا اس روز شکار کرنا ان کے لیے حرام تھا لیکن قدرت بھی ان کے ایمان کی قوت کو جانچنا چاہتی تھی۔ کیونکہ یہ اس کی قدیم سنت ہے کہ ایک طرف تو وہ مرغوبات نفس کے اتھاہ سمندر میں ڈال دیتی ہے پھر یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ہوشیار! دامن عزیمت تر نہ ہو۔ یہود جیسی بے صبری قوم کے لیے اس نے سبت کے دن شکار کی ممانعت کر دی اور دریا کی مچھلیوں کو حکم دیا کہ وہ خاص کر اسی روز سر نکال کر سطح آب پر تیریں۔ آخر کار ان کی لالچی طبیعتیں صورت حال کا مقابلہ نہ کر سکیں، لیکن کھلم کھلا قانون الٰہی کی خلاف ورزی اور سبت کی بے حرمتی بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس وجہ سے ترکیب یہ نکالی کہ دریا کے کنارے اس سے متصل ایک چھوٹا سا تالاب کھود ڈالا، جب سبت کے دن مچھلیاں سر اٹھا اٹھا کر تیرنے لگتیں یہ تالاب کا دہانہ کھول دیتے مچھلیاں

اس میں چلی جاتیں، شام کو دہانہ بند کر دیتے اور دوسرے روز تمام مچھلیاں پکڑ لیتے ۔ قرآن نے ان کی اس حیلہ جوئی کو عدوان سے تعبیر کیا ہے اور جہاں یہود کی بہت سی علمی و عملی گمراہیاں گنائی ہیں اس شرارت کو بہت زیادہ نمایاں طریقہ سے بیان کیا ہے اور اس کے ذریعہ سے یہود پر الزام رکھا ہے کہ جس قوم کی باطنی بغاوتیں اس حد تک پہنچ چکی ہوں اور دنیا کا عشق جس کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا ہو وہ کس طرح آسمانی بادشاہت کے تاج و تخت کی سزاوار ہو سکتی ہے۔

وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ الآية (اعراف ۲۱)

اس قریہ کے متعلق ان لوگوں سے پوچھو جو لب دریا واقع تھا جب کہ وہاں کے باشندے سبت کے معاملہ میں زیادتیاں کرتے جبکہ ان کے سبت منانے کے دن مچھلیاں سر نکال نکال کر آتیں (تیرتیں) اور جب سبت کا دن نہ ہوتا نہ آتیں۔

لیکن یہ حیلہ سازیاں وہ کس کے ساتھ کر رہے تھے؟ اس زبردست اور انتقام لینے والے قادر مطلق کے ساتھ جو باطن کے بھیدوں کو جاننے والا اور دل کی نیتوں کو پڑھ لینے والا ہے۔ اس عدوان پر اس کے انتقام کا چہرہ بھی تمتما اٹھا اور اس نے انھیں انسانی حدود سے نکال کر سوروں اور بندروں میں ملحق کر دیا کہ دنیا کو عبرت ہو۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُونُوا قِرَدَةً خَاسِئِينَ فَجَعَلْنَاهَا نَكَالًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِلْمُتَّقِينَ (بقرہ ۔ ۸)۔

جہل و رائے پرستی اور تعلیم کتاب سے بے خبری یہ ساری امم سابقہ کی سنت چلی آرہی ہے کہ پیغمبر کے دنیا سے چلے جانے کے بعد زمانہ جوں جوں گذرتا جاتا ہے عام افراد امت شریعت کی صاف اور ستھری تعلیمات کو بھلاتے جاتے ہیں، اس وقت شریعت کا حقیقی نور ظواہر و رسوم کے حجابات میں گم ہو کر رہ جاتا ہے، جو

باتیں پہلوں سے منقول ہوتی چلی آتی ہیں وہ ان کا دین و ایمان بن جاتی ہیں۔ ان کے سامنے کتاب الٰہی اور اسوۂ رسول کا جاننا اور سمجھنا ایک فضول اور بے کار چیز ہو جاتی ہے فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَاةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ ۔ بیشتر اسرائیلیوں کا طرز عمل یہی تھا۔ ان کے یہاں کتاب الٰہی تو مہجور و متروک تھی لیکن چند ٹونے ٹوٹکے اور کچھ ملفوظات فاسدہ سرمایۂ دنیا و آخرت بن گئے تھے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (بقرہ ۹)

ان میں بہت سے امی اور جاہل ہیں کتاب (کی تعلیمات) کو جانتے سمجھتے نہیں سوا اپنی خواہشوں کے اور وہ صرف اٹکل پچو ہانکتے ہیں

جو قوم حبل اللہ کا رشتہ ہاتھ سے چھوڑ دے گی کتاب الٰہی کو اہواء و امانی پر نثار کر دیگی ظن و تخمین کو علم، اور تقلید آبا کو اتباع کتاب و سنت قرار دیگی بھلا وہ کب فلاح پا سکتی ہے؟ ہر آسمانی صحیفہ قوم کی زندگی کا مکمل دستور العمل ہوتا ہے جس کی طرف وہ چھوٹے بڑے ہر امر میں رجوع کرنے پر مجبور ہے لیکن جب اس پر بدبختی سوار ہوتی ہے تو اس کے افراد اس صحیفۂ الٰہی سے بے خبر ہو جاتے ہیں، اس کے فہم و تدبر میں اپنا وقت صرف کرنا پسند نہیں کرتے اور اگر کبھی ان کے سامنے حقیقت عریاں ہو کر سامنے آتی بھی ہے تو یہ کہکر ٹال دیتے ہیں کہ "مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" قرآن اہل کتاب کو مخاطب کر کے ان کی اس کورانہ تقلید اور ضلالت پرستی کی سخت مذمت کرتا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ (مائدہ ۱۰)

اے اہل کتاب اپنے دین میں خلاف حق غلو مت کرو اور نہ ان لوگوں کی پیروی کرو جو تم سے پہلے گمراہی کی راہ چل چکے ہیں اور بہتوں کو گمراہ بھی کیا ہے اور سیدھی راہ سے بہک گئے ہیں۔

یہ مرض بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ گذشتہ قانون میں یہی وقت ہوتا تھا جب قوم کا سفینۂ غرق

ہونے کے قریب ہوتا اور انبیاء کرام کا ورود ہوا کرتا تھا۔

یہ اہل کتاب کی تاریخ حیات کا آئینہ اور ان کے تعلقات دینی کی اجمالی تصویر ہے جس کے اندر ان کے جرائم اور بداعمالیوں کے وہ موٹے موٹے خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں جنہیں قرآن نے خلافت الٰہی کا تاج چھینتے وقت اتمام حجت کے لیے انھیں پڑھکر سنایا تھا۔ رہیں چھوٹی چھوٹی کمزوریاں اور ہلکی شرارتیں سو اس پر مزید قیل و قال کی کیا حاجت ع

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

جو اونٹ نگل سکتا ہے اُسے مچھر چھاننے کی ضرورت ہی کیوں ہونے لگی؟ جس قوم کا جسم اتنا داغدار ہو اس سے خلافت کی خلعت سعادت اگر اتار نہ لی جاتی تو کیا سنت الٰہیہ کا صریح ظلم نہ ہوتا۔

اب اس آئینہ میں موجودہ مسلمانوں کے خصائص اور حالات کا عکس دیکھیے۔ ایک ایک خط و خال کا مقابلہ کیجیے۔ پھر بتلائیے کہ وہ کونسی قرارداد جرم ہے جو یہودیوں کے جرائم کی فہرست میں تو موجود ہے لیکن مسلمانوں کا نامۂ اعمال اس سے خالی ہے؟ فتنوں کا جو سیاہ بادل ہیکل سلیمانی کے محافظوں پر چھایا ہوا تھا کیا وہ انھیں مہیب تاریکیوں کے ساتھ معبد خلیل کے پرستاروں پر محیط نہیں ہوگیا ہے؟ یہود کا حال قرآن نے بیان کیا ہے جس کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں۔ مسلمانوں کا حال زمانہ سنا رہا ہے جس کی شہادت میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔ دونوں کے حالات کو ملائیے پھر خدارا مجھے بتلائیے کہ کیا لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ کی ساعت منتظرہ ابھی نہیں آئی؟ جنہیں اس کا یقین نہ ہو اور ابتک انتظار باقی ہو، انہیں یقین کر لینا چاہیے کہ ان کا یہ انتظار کبھی ختم نہ ہوگا۔ باللہ العظیم وہ وقت آگیا جس کی پیش گوئی صادق و مصدوق نے کی تھی۔ کہ ہمارا ہر قدم اہل کتاب کے ہلاکت خیز راستے پر اٹھ رہا ہے۔ ملی افتراق اور قومی تشتت کا دردناک منظر ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ فرقہ پرستیوں کی وبا

بُری طرح پھوٹ پڑی ہے۔ حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ اہل کتاب تو صرف بہتر ہی فرقوں میں منقسم ہوئے تھے لیکن مسلمان تہتر گروہوں میں بٹ جائیں گے' سو آنکھوں نے وہ بھی دیکھ لیا۔ ماتم کا مقام ہے اس امت کے حال پر جو دنیا میں وحدت کا پیام لے کر آئی تھی مگر آج اس کے شیرازہ کا پتہ تک نہیں' ہر فرقہ بزعم خود توحید ابراہیمی کا علمبردار اور اسوۂ محمدی کا دعویدار بنا بیٹھا ہے' اور دوسروں پر جہل و بدعت' اور فسق و فجور کا الزام رکھکر اس کی بیخ کنی کرنے کے لیے اپنے خون کے قطرے بہانے تک کو تیار ہے۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے اختلاف پر آستینیں چڑھ جاتی ہیں' جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ کیا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔ کا اس سے بڑھ کر کوئی مظاہرہ ہو سکتا ہے؟ کیا اسلام کے نادان حمایتیوں کو یہ نہیں معلوم کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ کی وعید صرف یہودیوں ہی کے لیے نہ تھی؟ اگر انھیں معلوم ہے تو پھر یہ شیعیت' یہ سنیت' یہ اعتزال' یہ اشعریت' یہ اسمٰعیلیت یہ خارجیت کیا بلا ہے؟ بہائیت اور قادیانیت کونسی لعنت ہے؟ ظاہریت اور باطنیت کی تفریق کہاں سے آئی؟ وہابیت اور مقلدیت کے اکھاڑے کہاں سے قائم ہوئے؟ کیا یہ وہی لعنت نہیں جو یہود پر مسلط کی گئی تھی؟ حاشا میں یہ نہیں کہتا کہ مسائل شرع میں اختلاف کیوں ہو جاتا ہے؟ یہ اختلاف تو فطری چیز ہے لیکن ان اختلافات کی بنا پر فرقہ پرستی اور ہنگامہ آرائی جس کے شور سے سارا عالم اسلام کانپ رہا ہے یقیناً لعنت ہے اور سراپا یہودیت جس سے پیغمبر کو تبری کا حکم دیا گیا تھا۔ کیا مسلمانوں کے لیے سوچنے کی بات نہیں؟

تحریف کتاب کے بارے میں بھی مسلمان اپنے امکان بھر یہودیوں سے پیچھے نہیں رہے۔ معنوی تحریفات دل کھول کر کی جا رہی ہیں لیکن تحریف لفظی سے مجبور ہیں کیونکہ شروع ہی سے خدا نے اس کتاب کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ ورنہ یہ کام بھی کب کا ہو چکا ہوتا۔ زمانہ کی ستم ظریفی!

جو حماسہ اور ابن خلدون کے فقروں کا صحیح ترجمہ بھی نہیں کر سکتے وہ دن دھاڑے قرآن کی تفسیر میں بیان کرتے اور ایک نہ ایک اجتہاد کیا کرتے ہیں جسے اسلامی تعلیمات سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔

کتمان حق اور اکل حرام تو آج مسلمانوں کا خاص شیوہ ہے۔ دنیا کے تمام معاملات تو چھوڑیئے کہ وہاں تو ان کے نزدیک حق و باطل کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، دین و شریعت کے اہم امور تک میں ہم ایمان بیچ بیٹھے ہیں۔ حلوے مانڈے کی خیر ہے تو حق کو باطل ثابت کر دینا کوئی چیز ہی نہیں ہے ہم میں سے کتنے ہیں جو علمائے وقت اور پیشوائے دین ہیں لیکن حکومتوں کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں، ایک ہاتھ میں حکومت کی رشوتیں اور دوسرے میں افتار کا قلم، پھر خانہ کعبہ پر نعوذ باللہ گولیاں چلانا مقصود ہو تو بھی باک نہیں۔ فتویٰ جواز کا ل ہی جائے گا۔ تو پھر کیا اس امت میں اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ کی کمی ہے؟ اور کیا ان نام نہاد مسلمانوں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ؟

یہود کی بزدلی اور زر پرستی (حب عاجلہ اور کراہیتہ موت) ضرب المثل مانی جاتی ہے لیکن کیا مسلمانوں کا سواد اعظم آج ان کی امتیازی خصوصیت میں ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا؟ خدا نے تو کہا تھا کہ اس نے مسلمانوں کا جان و مال خرید لیا ہے لیکن آج کے مسلمان کہتے ہیں کہ نہیں ہم نے دنیا اور دنیا کی زندگی کو مرضات الٰہی اور نعمات اخروی کے بدلہ خرید لیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کبھی اسلام کی تعبیر سمجھی جاتی تھی لیکن آج کے مسلمان اس حقیقت سے کس قدر دور ہیں، چالیس پچاس کروڑ کی آبادی میں مشکل تین چار کروڑ ایسے مسلمان نکلیں گے جو دشمنان الٰہی کے زور و اقتدار سے آزاد ہو گئے آخر یہ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ کی لعنت انھیں کہاں سے ملی؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ مسلمان نے یہاں

عاشق اور جاہ و مال کا شیدا ہو گیا ہے؟ اس کی روح شوق شہادت سے بے کیف، تمنائے حیات سرمدی کے نور سے بے بہرہ، اور جبن و کراہیۃ موت کی غلاظتوں سے اٹی ہوئی ہے، وہ غیروں کے سایہ کو غنیمت سمجھتا اور غلامی کی زندگی میں مگن ہے۔ انفاق اور جہاد کا نام سنکر لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ تین سو تیرہ مسلمان سارے عرب و عجم کے خلاف علم جہاد بلند کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن یہاں چالیس کروڑ کی جمعیت لَا تُلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ کی آڑ میں پناہ لے رہی ہے! سچ کہیے کیا یہ لوگ بزبان حال اپنے رسول کو یہ جواب نہیں دے رہے ہیں کہ اِذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْنَ؟ کیا یہودیوں نے اس کے علاوہ کچھ اور کہا تھا؟ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

رہ گیا علماء سو کا عذاب اور ترک امر بالمعروف کا جرم سو کس صاحب نظر سے وہ پوشیدہ ہے؟ علماء نے فتنہ انگیزی اور تکفیر بازی کا مشغلہ اختیار کر لیا، پیروں کو روپے اینٹھنے اور قبروں کا طواف کرنے سے فرصت ہی نہیں ملتی، عوام ان کی شفاعت کا یقین کر کے مطمئن بیٹھے ہیں۔ کیا یہ اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ کے حکم سے باہر ہیں؟ یا لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ کی وعید سے ان کے کان نا آشنا ہیں؟ امر بالمعروف تو اس امت کا خاص مشن تھا، خدا نے خیر الامم اور شہداء للناس بنا کر اسے مبعوث کیا تھا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا خطاب تو اسی کو ملا تھا لیکن ہمارے رہنمایان ملت اس وقت کیا کر رہے ہیں؟ آخر وہ وراثت نبوی کا حق کہاں تک ادا کر رہے ہیں؟ غیر اقوام تک حق کی آواز کا پہونچانا تو در کنار خود مسلمانوں کو مسلمان بنانے کی بھی یہ زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ہندوستان کے اندر کروڑوں مسلمان ایسے موجود ہیں جو کلمہ شہادت تک نہیں جانتے۔ ہمارے علماء کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ کسی بڑے اور تعلیمیافتہ مجمع میں کھڑے ہو کر طلاقت لسان اور قوت گویائی کا مظاہرہ کر دیں بس دارین کے

فرائض سے سبکدوش، پھر جو کچھ زبان سے آندھی طوفان کی طرح سناتے بھی ہیں ان کا ظاہر و باطن ان حقائق سے یکسر کورا ہوتا ہے جو زبان پر آتا ہے دل میں نہیں ہوتا۔ چاہیے تھا کہ خود سراپا عمل بن جاتے پھر ان کی زبانیں خاموش رہتیں لیکن ان کے جسم کا ایک ایک رونگٹا اسلام کا مبلغ بن جاتا اور ان کی پیشانیوں پر چمکتے ہوئے نور حق کا جلال فراعنہ وقت کی گردنوں کو خود بخود جھکا دیتا۔ ورنہ کھوکھلے سینوں اور بے سوز حلقوں سے نکلی ہوئی صداؤں کی تو آج بھی کمی نہیں۔ خدارا تبلائیے سفینہ اسلام کے ٹوٹے ہوئے تختوں کو تھپیڑے دے دے کر غرق کر دینے اور قوم و ملت کی زخمی روح پر ہلاکت کی چھری پھیر دینے کا خون ناحق کس کی گردن پر ہوگا؟ کیا ہمارے پیشواؤں نے کل کے لیے احکم الحاکمین کے سامنے "اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ" کا کوئی جواب سوچ رکھا ہے؟

دینی معاملات میں عموماً اور دنیوی امور میں خصوصاً احکام شرعی سے بے اعتنائی تو اس قدر عام اور عالمگیر ہو چکی ہے کہ اس پر تمام امت کے اجماع کر لینے کا دھوکا ہوتا ہے۔ مذہب اور سیاست دو متضاد حقیقتیں مان کر مذہب کو سیاسی حدود سے بالکل باہر پھینک دیا گیا ہے۔ اسے ترقی سے مانع اور روشن خیالی کا دشمن خیال کیا جا رہا ہے۔ غلام آباد ہند کو تو چھوڑئیے کہ یہاں کے مسلمانوں کا نام سن کر غیرت اسلامی کی پیشانی، عرق آلود ہو جاتی ہے، وہ ممالک اسلامی جو آزاد ہیں اور جن کی حدود میں اپنا قانون چلتا ہے وہ مغربی اصول و ضوابط کے سامنے احکام دینی کو عہد جاہلیت اور دور وحشت کی یادگار قرار دے رہے ہیں۔ ہر ممالک حجاز کو چھوڑ کر سارا عالم اسلامی یورپ کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ ممکن ہے کل کو وہ ترقی اور حریت کے آخری زینے پر پہنچ جائے لیکن کیا اس کی یہ ترقی اور آزادی خدا کی نظروں میں بھی محبوب ہو سکتی ہے؟ یہ کیسی بدبختی ہے کہ خلافت الٰہی کے ذمہ دار قانون الٰہی کی اس طرح بے حرمتی کر رہے ہیں۔ کیا وہ قرآن پڑھتے وقت وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الظّٰلِمُوْنَ کی آیت قاہرہ پر یہودیوں کے مثل ہاتھ رکھکر اسے چھپا دیتے ہیں؟ یا پڑھ کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں؟

یہود نے کفار اور مشرکین سے جس حد تک موالاۃ کی تھی مسلمان اس سے کئی قدم آگے پہنچ چکے ہیں۔ کتاب و سنت نے کس طرح بار بار انھیں اس شنیع اقدام سے منع فرمایا تھا حتّٰی کہ یہ بھی کہدیا تھا کہ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ فَهُوَ مِنْهُمْ (جو ان معاندین حق سے ربط و اتحاد رکھیں گے وہ بھی انہیں میں سے شمار کیے جائیں گے) لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حاملین کتاب اور خلافت الٰہی کے قائم کرنے والوں نے دوپہر کی روشنی میں کفار اور مشرکین کے گلے میں باہیں ڈالدیں اور پھر یہی نہیں کیا بلکہ وہ بھی کیا جس کا تصور کرکے ایمان و انسانیت کی گردنیں رنج و حسرت کے بارے جھک جاتی ہیں۔ جنگ عظیم میں عربوں کی پاک گولیوں سے ترکوں کے کلیجے چھلنی ہوتے کس نے نہیں دیکھے؟ نیز برطانیہ کے پہلو بہ پہلو ہندوستان کے سلامی سپوتوں کی اپنی ہوی سنگینوں کو مقامات مقدسہ کی حرمت برباد کرنے کا دردناک نظارہ کن نگاہوں سے اوجھل ہوچکا ہے؟ کیا یہ سب کچھ ہوچکنے کے بعد بھی موالات کفار کی کوئی منزل باقی رہ جاتی ہے؟ قرآن نے دعوی کیا تھا کہ کوئی جماعت ایسی نہیں پائی جاسکتی جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان بھی رکھتی ہو اور ساتھ ہی دشمنان الٰہی سے الفت و محبت بھی رکھتی ہو لیکن بیسویں صدی کا مسلمان اٹھا اور اس نے دکھانے کی کوشش کی کہ نہیں ہم اس محال کو ممکن ثابت کردیں گے (العیاذ باللہ)۔

یہودیوں نے حیلہ سازیوں کے ذریعہ شریعت کو بازیچہ بنا ڈالا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ سوٗر اور بندر بنا دیے گئے۔ آج کے بیشتر مسلمانوں کا ظل عافیت بھی تو یہی حیلے ہیں۔ فقہائے کرام نے حکومت کے لیے قوانین وضع کرتے وقت حیل کا جو باب قائم کیا تھا انہوں نے اس بارہ میں صحیح راہ اختیار کی یا غلط ہمیں

ان کی نیتیں ٹٹولنے کا کیا حق؟ پر اتنا تو ضرور ہے کہ یہ حیلے خدا کے نزدیک رسوائی کا باعث ہوں گے، امیر وقت مجبور ہے کیونکہ وہ ظاہر کو دیکھتا اور اسی پر فیصلہ کرنے پر مجبور ہے لیکن عالم الغیب تو باطن کو دیکھتا ہے اس کا فیصلہ اسی کے مطابق ہوگا تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہر اسلامی دنیا سے باخبر انسان کو معلوم ہے کہ مختلف حیلوں سے کتنے منہیات عین نیکی بن گئے اور قوم کی جہل و شہوت پرستی بلا تامل انھیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے کیونکہ ان کے ذریعہ نفس کی بہت سی خواہشیں پوری ہوجاتی ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کو اصحاب سبت کی مثال سامنے رکھنی چاہیے۔

رہ گئی باہمی عداوت اور منافرت سو وہ مسلمانوں کی زندگی میں ایسی نمایاں چیز ہے جسے نمایاں کرنے کی کوشش کرنا آفتاب کو چراغ دکھاتا ہے۔ سیاسی اختلافات ہوں یا خالص دینی، مدتوں سے وہ اسلام کی جڑمیں گھن کی طرح لگے ہوئے ہیں، ہر جماعت دوسری جماعت کو گردن زدنی سمجھ رہی ہے آئے دن مناقشات کی ہنگامہ خیز خبریں سننے میں آیا کرتی ہیں، قرآن کہتا ہے کہ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے سامنے جھکے رہتے ہیں اور کافروں کے لیے سخت ہوتے ہیں لیکن آج ہر مسلم کی تمام کوششیں دوسرے بھائی کی جان و مال اور عزت و آبرو کی بربادی پر صرف ہو رہی ہیں۔ حکومتوں اور ریاستوں کو تو چھوڑئیے کہ شہوات نفسانی پر ان کی بنا ہی قائم ہے محراب و منبر تک جنگ و پیکار کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔

کن کن مصیبتوں کو گنایا جائے علماء اور امراء کا جب یہ حال تو عوام کا خدا ہی حافظ۔

قرآن نے یہود پر الزام رکھا تھا کہ چند رسوم دہلوا ہرا اور اپنے ذہن کے تراشے ہوئے مظنونات کے سوا ان کے جیب و دامن میں ہے ہی کیا؟ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ لیکن کیا آج حاملین قرآن کی حالت بھی کم و کاست یہی نہیں ہے؟ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیے تو سہی؟ کتنے فیصدی مسلمان کتاب الٰہی

کیا اسرار و حکم نہ سہی اس کی موٹی موٹی تعلیمات ہی کو جانتے اور سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ جب یَا رَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا کی فریاد بارگاہ صمدیت میں پیش ہوگی اس وقت کی ہولناکیوں، پریشانیوں، لعنتوں اور پھٹکاروں سے یہ نام نہاد مسلمان مامون و مصئون رہیں گے جن کو قرآن کی چند آیتیں بھی سمجھ کر پڑھ لینے کی توفیق نہیں؟

سورۂ مائدہ کی تفصیلات کو دیکھا جائے تو باول وہلہ یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آتی ہے، کہ شریعت خدا اور بندہ کے درمیان ایک میثاق ہے جسے رسول کے ذریعہ باندھا گیا ہے چنانچہ ایک جگہ صاف تصریح ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا - الآیۃ تو پھر وہ لوگ اس میثاق میں کس طرح داخل ہو سکتے ہیں جنھیں اس کی اساسی دفعات سے بھی واقفیت نہ ہو؟ میرے خیال میں یہ مسئلہ نہایت نازک اور تفصیل کا طالب ہے خوف طوالت مانع ہے اس لیے کسی اور فرصت کے لیے اٹھا چھوڑتا ہوں۔ یہاں صرف اس قدر اشارہ کرنا مقصود تھا کہ مسلمان اپنی کتاب سے کس قدر بے خبر اور دور رہیں، حتّٰی کہ ان کا سواد اعظم لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ کا حقیقی مصداق بن چکا ہے۔

آپ نے یہود کے متعلق قرآن کا بیان سن لیا، مسلمانوں کی روداد بالاختصار پڑھ چکے ان دونوں امتوں کے متعلق تحریر کا دامن جتنا ہی پھیلے گا اسی قدر حقیقت واضح ہوتی جائے گی! ایسی کامل مشابہت اور ایسا مکمل تطابق دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمان اپنے پہلوں کے نقش قدم پر ٹھیک ٹھیک نہیں چلے، اور نبی صادق کے مقدس ارشاد کا ابھی ظہور نہیں ہوا؟ پھر اگر یہ کہا جائے کہ جن علمی و عملی گمراہیوں نے یہود کو بے تاج و تخت کیا تھا بے کم و کاست انہیں خرابیوں نے مسلمانوں سے امام خلافت چھین لی ہے اور وہ آج مجموعی لحاظ سے سب سے زیادہ باعزت سب سے زیادہ سربلند

اور سب سے زیادہ نعمات الٰہی کے مستحق ہونے کے بجائے سب سے زیادہ ذلیل، سب سے زیادہ پست اور سب سے زیادہ مفلوک الحال ہیں۔ اور یہی سنت الٰہیہ کا اصول ہے جس کو وہ ابتدائے آفرینش سے اب تک عالم اسباب میں چلاتی رہی ہے اور قیامت تک چلائے گی۔

کیا اب مسلمان ترقی کریں گے؟ جو ہونا تھا وہ ہو چکا لیکن اب زمانہ کی رفتار اور انقلابات کی سریع السیر گردش کے پیش نظر یہ دیکھنا ہے کہ کیا اب پھر مسلمان ابھریں گے اور ان کے سرد لہو میں زندگی کی حرارت پیدا ہوگی؟ ممکن ہے دنیا اس کا جواب نفی میں دے لیکن میرے خیال میں حالات کچھ اور کہہ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے اندر بہت کچھ خامیاں ہیں اور ساتھ ہی یورپین قومیں اپنی معاشی اور عمرانی مشکلات کے لیے اپنے پنجۂ استعماریت کی گرفت محض سخت سے سخت ہی کرنا نہیں چاہتیں بلکہ نت نئی غنیمتوں کی تلاش میں ہیں لیکن وقت کچھ ایسا آگیا ہے کہ اب دنیا کی بے جان چیز بھی حرکت کرنے کا ولولہ رکھتی ہے اور قومیت و خودداری اور زندگی کی جو لہریں دنیا کے مخصوص گوشوں میں اٹھ رہی تھیں وہ اب ربع مسکون کے ذرہ ذرہ پر چھا گئی ہیں۔ دوسری طرف دول متمدنہ کی باہمی چپقلش اور حاسدانہ آویزش نے اپنی ہی حفاظت کو دشوار بنا دیا ہے۔ نئے نئے مقامات پر قبضہ کر کے انہیں دشمنوں کی دست برد سے بچانا محال ہو رہا ہے۔ لہٰذا مسلمان بڑھیں گے اور ضرور بڑھیں گے۔ زمانہ جلد دیکھ لے گا کہ وہ بھی ایک دوسرا یورپ بنا کر چھوڑیں گے۔

ترقی کی دو راہیں ہاں صرف سوال یہ ہے کہ ان کی ترقی کا راستہ کونسا ہوگا؟ اس کا جواب جو کچھ بھی ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان کی ترقی کی راہیں کون کونسی ہو سکتی ہیں؟ میرے ناقص خیال میں دو راہوں کے سوا تیسری کوئی راہ نہ ہوگی۔ یا تو وہ یورپ کے سانچے میں ڈھلیں اور اس کے اصول کو لیکر میدان میں اتریں یا پھر گردن موڑ کر پیچھے ہٹیں اور صدیق اکبر، فاروق اعظم، حیدر کرار، خالد سیف اللہ اور عثمان غنی (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو اسوہ قرار دیں اور کتاب الٰہی کو لے کر میدان میں

آئین یہ دونوں راہیں مادی ترقی کی راہ میں کامیاب ثابت ہو چکی ہیں لیکن روحانی و اخلاقی ترقی کے لیے ایک اور صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ وہی ہے جو خدا نے بتائی ہے۔ یہود کو معزول و مغضوب کر دینے کے بعد اس نے انھیں ازسر نو زندگی اور قوت حاصل کرنے کا راستہ بتلایا تھا کہ اگر تم خلافت الٰہی کی کھوئی ہوئی نعمتوں سے فراز ہونا چاہتے ہو تو میری خالص اطاعت اور میرے احکام کا کامل اتباع کرو۔ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (بقرہ ۱۳)۔ اگر تم قرآن کو قائم کرو اور اس کی رو میں راہ نجات تلاش کرو تو تم بہرحال نعمات الٰہی کے حق دار ہو گے کیونکہ اس سے بڑھ کر صاف اور سیدھی راہ کوئی نہیں۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ کا نسخہ سماوی انھیں یہود کو تبلایا گیا تھا۔ یہود کی کتاب محرف ہو چکی تھی۔ ہدایت کے لیے دوسرا دستور العمل نازل ہوا۔ مسلمانوں کی کتاب محفوظ ہے۔ انھیں دوسرے صحیفہ کی ضرورت نہیں۔ وہ اس پر عمل کر سکتے ہیں۔ اسلام کے پیروں کو ترقی کی دُھن میں اور کامیاب راہ کی جستجو کے شوق میں اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ کو ضرور سامنے رکھنا چاہیے۔

قائدین امت سے خطاب اب سوچنے اور غور کرنے کا مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کا طبعی رجحان کس طرف ہے؟ کونسی راہ ہے جسے وہ اپنے لیے زیادہ مفید، پرامن اور کامیاب سمجھ کر اس پر چلنا چاہتے ہیں؟ ترکی، ایران اور عراق ترقی کے قدم نسبتاً آگے بڑھا چکے ہیں لیکن اس طرح پر کہ گویا مذہب اور دنیوی زندگی کی راہیں الگ الگ ہیں۔ افغانستان اور مصر کا تیور بھی کچھ یہی کہہ رہا ہے۔ ان اسلامی ممالک میں تقلید یورپ اور اتباع مذہب دونوں کا تصادم ہو رہا ہے لیکن حالات سے ہر باخبر انسان بخوبی جانتا ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن، اسلامی تمدن، کلچر، اصول معاشرت، اور طرز حکومت پر کس طرح غالب ہوتا جا رہا ہے پھر اگر ان ممالک نے ترقی کی معراج حاصل کر بھی لی تو اللہ

اور رسول کی نظروں میں اس عزت اور ترقی کی کیا حیثیت ہوگی ؟ کیا یہ اسلامی حکومت کہی جا سکے گی؟ کیا خلافت الٰہی کا کھویا ہوا تاج و تخت انھیں حاصل ہو جائیگا ؟ کیا اس وقت انھیں تائید الٰہی حاصل ہو جائے گی ؟ کیا وہ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کے مصداق ہو جائیں گے ؟ کیا وہ متقین اور صالحین کی وہ جماعت بن جائیں گے جن کی نصرت کے لیے ملائکہ نازل ہوا کرتے تھے؟ اگر ایسا نہ ہوگا اور یقیناً نہ ہوگا تو ہمارے قائدین ملت کو وقت کی نزاکت کا احساس کرنا چاہیے اگر پوری امت اسی سیلاب کی رو میں بہ گئی تو پھر نہایت ہی ماتم کا وقت ہوگا۔ اس وقت امت کا خدا سے رہا سہا رشتہ بھی منقطع ہو جائے گا خطرہ ہے پھر معلوم نہیں ان خوفناک فتنوں کا قدرت کیا جواب دے ؟ اسلام کے دردمندوں کو چاہیے کہ ان فتنوں کے مقابلہ کے لیے بشرطیکہ انھیں اپنی مسئولیت اور ذمہ داری کا کچھ بھی ڈر ہو، خانقاہوں کی ہو ہا اور مدرسوں کے حجروں سے باہر نکلیں۔ کتاب الٰہی کی روشنی میں منزل مقصود کو تلاش کریں۔ امت کی شیرازہ بندی اور قوم کی مکمل تنظیم کا ہر ممکن طریقہ اختیار کریں، اور ان مفاسد کا سب سے پہلے سدباب کریں جو اختلاف و نزاع کے جراثیم پیدا کر کے وحدت امت کو ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ان کے ظاہر و باطن پر پڑے ہوئے غلاف ضلالت کو اٹھایا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے اتنے عظیم الشان انقلاب کا مطلب قوم کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالنا ہوگا جس کے لیے کافی غور و فکر کے ساتھ کافی حزم و احتیاط اور عزیمت و استقلال کی ضرورت ہوگی۔ اگر یہ کام کرنے کا ہے اور وقت کا سب سے پہلا اور ضروری فرض ہے تو ہمیں اپنا نظریہ پیش کرنے سے پہلے ارباب بست و کشاد کے فیصلوں کا انتظار ہے۔

رسائل و مسائل

بینکنگ اور انشورنس اسلامی نقطۂ نگاہ سے

رنگون سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"مسلمان دنیا میں یا تو محکومی اور غلامی کی وجہ سے یورپ کے تابع ہیں، یا بین الاقوامی تعلقات کی وجہ سے یورپ سے بندھے ہوئے ہیں، اور یورپ اپنے سیاسی غلبہ کی بنا پر ان کے ہر شعبۂ زندگی پر مستولی اور قابض ہے۔ مانا کہ اباحت کا دروازہ کھولنا سخت پر خطر ہے، مگر یورپ اور غیر مسلم قوموں کے بینکنگ سسٹم سے نجات پانے کی کیا صورت ہے؟ مسلمان خود تو بینک قائم نہیں کر سکتے، کیونکہ سود کے بغیر بینک نہیں چل سکتا، لیکن دوسرے بینکوں سے معاملہ کر کے لاکھوں کا سود دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور ان اجنبی بینکوں کے رحم پر ان کی زندگی اور تجارت موقوف ہو جاتی ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں انھیں دیوالیہ بنا دیتے ہیں۔ جہاں تک معاملات کا تعلق ہے، موجودہ دور میں بغیر بینک قائم کیے کوئی قوم شاید اپنی ساکھ نہ قائم رکھ سکتی ہے، اور نہ دوسری قوموں سے بے نیاز ہو سکتی ہے۔ آخر اس کا عملی حل کیا ہونا چاہیے؟ جب تک مسلمان غالب اور خلافت ارض کے مالک نہ بنیں اس وقت تک تو بظاہر دوسری قوموں سے اپنا اصول نہیں منوا سکتے۔

علاوہ بریں اس وقت ایک مسئلہ بیمہ کا بھی درپیش ہے۔ چند مہینے ہوئے یہاں ایک مہیب آتش زدگی میں مسلمانوں کی دو عظیم الشان مارکیٹیں جل کر تباہ ہو گئیں، اور چونکہ ان کا بیمہ نہیں ہوا تھا اس لیے کروڑ ڈیڑھ کروڑ بلکہ دو کروڑ کی ملکیت کا نقصان ہو گیا۔ اس مارکٹ میں

اکثر مسلمان تاجر ہی دوکان دار تھے۔ اب یہ بازار دوبارہ بن رہے ہیں اور بیمہ کی تجویز سامنے ہے۔ سوال یہ ہے کہ بیمہ میں کیا ربوٰ اور قمار دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں؟ یا یہ ایک تعاونی ریزرو فنڈ کی حیثیت رکھتا ہے جس کے شرکار نے اپنی رضامندی سے ایک دوسرے کی اعانت کے لیے آپس میں معاہدہ کرلیا ہے اور بیمہ کمپنی کو اپنا وکیل بناکر اس کی ذمہ داری ہیں اس کام کو دیدیا ہے؟ بہرصورت اس مسئلہ پر جو بھی جناب کی رائے ہو اسے ظاہر فرما دیں۔ عرصہ ہوا کہ جناب مولٰنا مفتی.... صاحب سے اس بارے میں گفتگو ہوئی تھی اور جناب نے سود کی اباحت کے متعلق مولٰنا مناظر احسن صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے جو دلائل پیش کئے تھے انھیں مفتی صاحب نے پسند فرمایا تھا۔ اسی عرصہ میں بیمہ کے متعلق .... (ہندوستان کا مشہور دارالافتار)... سے ایک فتویٰ شائع ہوا جس میں اسے ربوٰ اور قمار تسلیم کرتے ہوئے دارالحرب کی شرط پر اس شرط کے ساتھ کہ بیمہ کمپنی کے شرکار میں غیر مسلم بھی ہوں، اس کی اجازت درج تھی۔ یہ وہی اصول تھا جس پر جناب نے اعتراض کیا تھا۔ چنانچہ سلسلۂ گفتگو اس پر منتہی ہوا کہ اس معاملہ میں آپ کو لکھا جائے اور آپکی تحقیق سے فائدہ اٹھایا جائے۔"

ترجمان القرآن۔ اس سے پہلے ان صفحات میں "سود" کے مسئلہ پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے وہ اگر آپ کے پیش نظر ہے تو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہوگئی ہوگی کہ انسانی زندگی کے معاشی شعبے میں اسلام دراصل ایک اصلاحی تحریک ہے جس کا منشا مختلف طبقوں کی معاشی اغراض کے درمیان مصالحت اور توازن قائم کرنا ہے۔

انسان کی فطرت میں جو خودغرضی رکھی گئی ہے، وہ اگر ہر شخص اور ہر طبقہ میں ایک حد اعتدال پر رہے، اور اس کے ساتھ انسانی فطرت کے دوسرے بلند تر اخلاقی اوصاف ــــ ہمدردی، ایثار، فیاضی، حب نوع، قناعت، اقتصاد، وغیرہ ــــ کو بھی صحیح تناسب کے ساتھ بروئے کار آنے کا

موقع حاصل ہو، تو خدا کی زمین میں نوع انسانی کے تمام افراد کو ان کی فطری استعداد اور ان کے حقیقی مراتب
کے لحاظ سے زندگی بسر کرنے کے وسائل کافی اور وافی بہم پہونچ سکتے ہیں، اور کوئی ایسی معاشی ناہمواری
پیدا نہیں ہوسکتی جو اقتضائے فطرت کے خلاف ہو یا جس کا نتیجہ فساد فی الارض کی صورت میں رونما ہو۔
لیکن انسان کے ساتھ ابتدائے آفرنیش سے ایک ایسی قوت ـــ شیطانی قوت ـــ بھی لگی ہوئی
ہے جو ہمیشہ اس کی فطرت کے بلند تر اخلاقی اوصاف، یا بالفاظ دیگر اس کے انسانی خصائص کو
دباتی رہتی ہے، اور اس کے حیوانی خصائص کو فطری اعتدال کی حد سے زیادہ ابھار دیتی ہے تاکہ
وہ اپنے ملکوتی نصب العین کی طرف پرواز نہ کرسکے، اور اپنے نفس ناطقہ کی بہترین قوتوں کو ـــ
جو اس پرواز میں مدد دینے کے لیے بخشی گئی تھیں ـــ اپنی حیوانیت کا خادم بنا کر زمین میں فساد برپا
کرتا رہے۔ یہی شیطان ہے جو زندگی کے بہت سے دوسرے شعبوں کی طرح معاشی شعبے میں بھی انسان
کے فطری توازن و اعتدال کو بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انسانی جماعت کے مختلف طبقوں میں
مختلف صورتوں سے خود غرضی کے جذبے کو ابھارتا ہے۔ جو طبقے نسبتاً خوش نصیب ہیں ان کے اندر
یہ جذبہ حرص، بخل، سنگدلی اور بے دردی کی صورت اختیار کرلیتا ہے جس سے سرمایہ داری کی
انتہائی حالت پیدا ہوتی ہے۔ اور جو طبقے نسبتاً کم نصیب ہیں ان کے اندر وہ رشک و حسد اور
غیظ و غضب کی صورت اختیار کرتا ہے جس کی بدولت اس طبقہ کے لوگ جائز اور فطری سرمایہ داری
کے بھی دشمن ہوجاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں سرمایہ داروں کے خلاف نادار طبقوں کی خود غرضی صرف
چوری، ڈکیتی، ٹھگی، اور ایسی ہی دوسری بھونڈی شکلوں میں ظاہر ہوتی تھی اب جدید زمانہ میں اسی چیز
نے ایک بہت شائستہ اور باضابطہ شکل اختیار کرلی ہے جس کا بہت ہی پاکیزہ نام "اشتراکیت" ہے

اسلام کا مقصد انہی دونوں انتہاؤں سے انسان کو روکنا ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت
دونوں میں جہاں تک حق اور عدل ہے، اس حد تک وہ دونوں کی حمایت کرتا ہے، اور دونوں کو ملا کر ایک

معاشی نظام میں سمو دیتا ہے، مگر جہاں ظلم و عدوان کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں وہیں سے وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے، اور ان دونوں انتہاؤں کی طرف جانے والے راستوں کو بند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ معاشی مسئلہ پر نہ تو مالدار طبقے کے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالتا ہے کہ اشتراکیت اس کو سراسر عیب نظر آئے، اور نہ نادار طبقہ کی نگاہ سے اس کو دیکھتا ہے کہ سرمایہ داری اسے تمام تر گناہ ہی گناہ دکھائی دے۔ برعکس اس کے وہ مجموعی حیثیت سے پوری نوع انسانی کے مفاد کو پیش نظر رکھکر ایسا معاشی بند و بست کرنا چاہتا ہے جس میں سب انسانوں کی فطری خود غرضی کے لیے کافی گنجائش ہو، اور کسی کی خود غرضی اس حد تک نہ بڑھ سکے کہ وہ دوسرے کی خود غرضی کو پامال کردے۔

مختلف خود غرضیوں کے درمیان اس قسم کی مصالحت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ایک طرف انسان کے معاشی نقطۂ نظر کی اصلاح کی جائے، اور دوسری طرف قانون ایسا بنایا جائے جس کے ذریعہ سے سرمایہ دار کی خود غرضی کو حرص و بخل تک پہنچنے سے روکا جاسکے، اور نادار کی خود غرضی کو رشک و حسد تک بڑھ جانے کی ضرورت نہ رہے۔ قرآن میں یہ جو کہا گیا ہے کہ اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا[1]۔ اور وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ[2]۔ اور لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ[3] اور وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ ۚ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ[4] اور یَمْحَقُ اللّٰهُ

---

[1] شیطان تم کو خوف دلاتا ہے کہ نیک کاموں میں خرچ کرنے سے حقیر ہو جاؤ گے اور وہ تمہیں برائی کا حکم دیتا ہے مگر اللہ تم سے بخشش اور مزید عنایت کا وعدہ کرتا ہے۔

[2] جو کچھ تم راہ خیر میں صرف کرو گے وہ تمہیں پورا پورا واپس ملے گا اور تم پر ظلم نہ کیا جائیگا۔

[3] ایک دوسرے کے مال آپس میں ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ بلکہ آپس کی رضامندی سے تجارت ہونی چاہیے اپنے آپ کو ہلاک مت کرو۔

[4] جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ اس میں بخل کرتے ہیں، یہ گمان نہ کریں کہ ایسا کرنا ان کے حق میں اچھا ہے، نہیں وہ ان کے لیے بہت برا ہے۔

الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۱؎ اور وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ
فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۲؎ اور وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۳؎ اور اَللّٰهُ
يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۴؎ اور وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي
الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ ۵؎ اور نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ۶؎ تو یہ محض

اخلاقی تعلیمات ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں معاشیات کے صحیح اصول و مبادی کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے اور معاشی مسائل کے متعلق انسان کو ایک صحیح نقطۂ نظر دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ قرآن اور سنت نبوی میں معاشی تنظیم کے متعلق جو احکام دیے گئے ہیں ان سب کا اصل الاصول یہ ہے کہ جائز اور فطری سرمایہ داری جو انسان کی مادی فلاح و بہبود کے لیے ناگزیر ہے، نہ صرف محفوظ رہے بلکہ نشو و نما پاتی رہے مگر سرمایہ کی گردش کو سرمایہ داروں میں مقید نہ ہونے دیا جائے بلکہ ایسے دروازے عملاً کھول دیے جائیں جن سے ناداروں تک آپ سے آپ سرمایہ پہنچتا چلا جائے۔ سود کی حرمت اور زکوٰۃ کی فرضیت اس معاشی تنظیم کے اہم ترین ارکان ہیں۔ تحریم سود وہ سب سے بڑی طاقت ہے جس کے ذریعہ سے سرمایہ داری کو ظالمانہ سرمایہ داری کی حد تک پہنچنے سے روکا جا سکتا ہے۔ اور فرضیت زکوٰۃ وہ سب سے بڑی حکیمانہ تدبیر ہے جس سے جارحانہ اشتراکیت کا دروازہ خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ انسانی جماعت میں

۱؎ اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے۔

۲؎ تم جو سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال بڑھیں تو خدا کے نزدیک وہ نہیں بڑھتے۔

۳؎ تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت خدا نے دی ہے اس پر رشک نہ کرو۔

۴؎ اللہ جس کو چاہتا ہے خوب رزق دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔

۵؎ اگر خدا اپنے بندوں پر رزق میں خوب کشادگی کر دیتا تو وہ زمین میں سرکشی کرنے لگتے مگر وہ تو ایک اندازہ کے مطابق جتنا چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔

۶؎ ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان معیشت کے وسائل تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں اونچے درجے دیے ہیں تاکہ بعض لوگ بعضوں کو اپنا تابع بنائیں۔

کوئی عادلانہ معاشی نظام ان دو چیزوں کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا، اور اسلام نے اپنی معاشی تنظیم میں ان کو اساس و بنیاد کی حیثیت دے کر ہمیشہ کے لیے کیپٹلزم اور کمیونزم کے درمیان اپنے راستہ کو ایسے واضح نشانات کے ساتھ ممیز کر دیا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی اس کے خلط ملط ہونے کا امکان باقی نہیں رہا۔

دنیا میں مسلمان ہی وہ قوم ہے جس پر ظالمانہ سرمایہ داری کا استیصال کرنے، اور جارحانہ اشتراکیت کے اقدام کو روکنے، اور عادلانہ معاشی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ قرآن نے اس کو ایک صحیح معاشی نقطۂ نظر دیا ہے، اور اس کا فرض ہے کہ دنیا کے معاشی نقطۂ نظر کو بدل کر اس خاص نقطہ پر لائے۔ قرآن نے اُن کو معاشیات کے صحیح اصول و مبادی سکھائے ہیں اور اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ دنیا کو ان اصولوں کے مطابق معاشی زندگی کی تنظیم کرنا سکھائے۔ قرآن نے اس کو معیشت میں عدل قائم کرنے کے طریقے بتائے ہیں، اور یہ کام اسی کا ہے کہ دنیا میں ان طریقوں کو پھیلائے۔ مگر کیسے ماتم کا مقام ہے کہ یہ قوم دوسروں میں صحیح علم اور صحیح طریقِ معیشت پھیلانے کی ہمت تو چھوڑ ہی چکی تھی، اب اسے خود اس علم کی صحت میں بھی شبہ ہو رہا ہے، اب وہ دوسروں کے ظنونات و اہوا کو علم سمجھ کر لے رہی ہے، اب خدا کے بتائے ہوئے طریقہ پر چلتے ہوئے خود اس کے اپنے قدم ڈگمگا رہے ہیں اور وہ شیطانی طریقوں کی طرف جانے کے لیے حیلے اور بہانے ڈھونڈ رہی ہے۔

مسلمانوں میں ایک گروہ تو ایسا ہے جو قرآن سے معیشت کے اصول نہیں سیکھتا بلکہ آدم اسمتھ یا کارل مارکس سے سیکھتا ہے، اور اسے بغیر جانے بوجھے اسلامی معاشیات کے صحیح ہونے میں پورا پورا شک ہے۔ اس گروہ کا مفروضہ یہ ہے کہ قرآن ایک امی کی تصنیف ہے ــــ تصنیف کہنے کی جرأت نہیں، مگر تصنیف ہی فرض کر کے ایسی باتیں کہی جاتی ہیں ــــ اور یہ امی علم المعیشت کی تدوین سے ۱۱ سو برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس سے بیسویں صدی کی متمدن زندگی میں کسی معاشی رہنمائی کی توقع ہی کرنا فضول ہے، صحرائی زندگی کے لیے اس نے جو چند ہدایتیں دی تھیں وہ آج کس طرح قابلِ عمل ہو سکتی ہیں؟ آج کا معاشی

مذہب یا تو وہ ہے جو انیسویں صدی کے سوشلسٹ پیغمبر کارل مارکس نے پیش کیا ــــ نعوذ باللہ یہ لوگ اس کو پیغمبر ہی سمجھتے ہیں ــــ یا پھر وہ ہے جو دنیا کے ۹ حصے میں "کامیابی" کے ساتھ چل رہا ہے جس کا قبلہ بینک ہے اور جس کا امام ضامن انشورنس کمپنی۔ بدقسمتی سے ہم اس گروہ کو مسلمانوں کا گروہ کہنے پر مجبور ہیں کیونکہ اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ عملاً و اعتقاداً اسلام سے پھر جانے کے باوجود اس سے پھرنے کا اعلان کر دے، اور اگر وہ اعلان کر بھی دے تو ایک مسلمان کا انگریزی لیڈر کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسے لوگ صریح اعلان کے باوجود مسلم قوم ہی کے فرد رہیں گے۔

ایک دوسرا گروہ ہے جس کو معیشت کے علم اور اس کے اصول سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ ہر اس راستے پر جانا چاہتا ہے جس پر آسانی سے نفع حاصل ہو سکے، اور ہر اس راستہ سے بھاگتا ہے جو اس کو حصول منفعت سے روکنے والا ہو، یا جس میں اُسے کوئی مالی قربانی برداشت کرنی پڑے۔ جُوا، لاٹری، ریس، سٹّہ، سُود، غرض تمام فاسد معاملات کو اس نے اپنے لیے حلال کر لیا ہے، اور سرے سے اس کو یہ تسلیم کرنے ہی سے انکار ہے کہ روپیہ کمانے کے ممکن اور کامیاب طریقوں میں حلال و حرام کی تمیز کرنا کوئی معقول فعل ہے۔

یہ دو گروہ تو کم از کم معاشی حیثیت سے "شُدہ" ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو دنیا کے غلط اور فاسد نظام معیشت میں جذب کر دیا، اور اس اصلاحی تحریک سے نہ صرف عملاً بلکہ اعتقاداً بھی الگ ہو گئے جسے لے کر اسلام آیا ہے۔

اب رہ گئے عامۂ مسلمین، تو یہ خدا کے فضل سے مومن ہیں، خدا اور رسول کے احکام کو سچے دل سے مانتے ہیں، جن چیزوں کو حرام کیا گیا ہے انھیں حرام سمجھتے ہیں، اور ان سے بچنا چاہتے ہیں، اور جن چیزوں کو حلال کیا گیا ہے انہیں حلال سمجھتے ہیں اور اپنی معاشی جدوجہد کو انہی کے دائرے میں محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں اس امر کی پوری استعداد موجود ہے کہ اسلام کی اصلاحی تحریک کا علَم بلند کریں، لیکن یہ بیچارے اول تو علم

سے محروم ہیں، اور اس پر مزید یہ کہ ان کی قوتیں بھی منتشر ہو چکی ہیں۔ ان کو نہ اپنے اُس مشن کا شعور ہے جو خدا نے ان کے سپرد کیا ہے۔ نہ اُس کے علمی اصول و مبادی کو یہ سمجھتے ہیں۔ نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ اس مشن کو عملاً قائم کرنے اور پھیلانے کے طریقے کیا ہیں۔ اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ سیاسی محکومی نے ان کے معاشی نظام کو درہم برہم کر دیا ہے، اور یہ ایسی حالت میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ ان کے لیے خود ہی اپنے مذہب کے اصولوں پر قائم رہنا مشکل ہو گیا ہے، کجا کہ دنیا میں ان کو پھیلا سکیں۔

اس قوم میں صرف ایک گروہ، علمار کا گروہ ایسا ہو سکتا تھا جو اس کو علمی اور عملی حیثیت سے اُن ذمہ داریوں کا بار اٹھانے کے قابل بناتا جو خیر امۃ اخرجت للناس ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی ہیں۔ مگر افسوس کہ اس گروہ نے خود اپنی ذمہ داریوں ہی کو نہ سمجھا۔ ان کا فرض تھا کہ معاشیات کا مطالعہ کرتے، دنیا کے معاشی مسائل کو سمجھتے، اسلام جس معاشی اصلاح کا داعی ہے اس کے اصولوں کا فہم حاصل کرتے، وہ طریقے دریافت کرتے جن سے کسی معاشی پالیسی کو روبعمل لایا جا سکتا ہے، ان اسباب کو سمجھتے جن کی بدولت مسلمان اس وقت معیشت کے میدان میں شکست کھا رہے ہیں، اور مسلمانوں کی رہنمائی اس طور پر کرتے کہ وہ خود اپنے معاشی نظام کو درست کر کے دنیا میں اسے پھیلانے کے قابل ہو جاتے۔ لیکن انہوں نے اس سلسلہ میں کچھ بھی نہ کیا۔ تاہم یہی بساغنیمت تھا کہ ایک طویل مدت تک وہ اپنے مقام پر سختی کے ساتھ قائم رہے، جن طریقوں کو خدا اور اس کے رسول نے حرام کہا تھا انھیں حرام ہی کہتے رہے، اور دنیا جس غلط روش پر جاری تھی اس کی پروا کیے بغیر مسلمانوں کو یہی تعلیم دیتے رہے کہ ان احکام کی پابندی کریں جو خدا نے انھیں دئے ہیں۔ اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو تھا کہ کوئی گروہ اُس مشن کو یاد دلانے والا موجود تھا جسے مسلمان بھولتے جا رہے تھے۔ مگر وائے بدقسمتی کہ ہزیمت کے اثرات اب ہماری آخری صفوں تک بھی پہنچ رہے ہیں، ہماری فوج کا وہ دستہ بھی پسپا ہو رہا ہے جو آگے نہیں بڑھ رہا تھا تو کم از کم اپنی جگہ پر ہی ثابت قدم تھا۔

علماء میں سے ایک جماعت کا حال تو یہ ہے کہ ان میں مداہنت پیدا ہوتی جارہی ہے۔ مدتوں سے جدید تعلیم یافتہ حضرات ان بزرگوں کو قدامت پرستی اور تاریک خیالی کے طعنے دے رہے تھے اور ان پر الزام دھرتے تھے کہ آپ زمانے کے ساتھ نہیں چلتے۔ یہ طعنے ان کی طاقت برداشت سے زیادہ سخت ثابت ہوئے، حتّٰی کہ جو لوگ برطانوی سپاہیوں کی لاٹھیاں کھاسکتے تھے، جیل کی کڑیاں سہہ سکتے تھے، وہ بھی ان طعنوں کی سہار اپنے اندر نہ پاسکے۔ پروپیگنڈا کی طاقت اور فاسد ماحول کی طاقت، مادی ظلم وستم کی طاقت سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی، اس نے علم اور کیرکٹر کی طاقت کو دبالیا، اور یہ بزرگ اس بات پر آمادہ ہوگئے کہ اپنے آپ کو روشن خیال اور اپ ٹو ڈیٹ عالم ثابت کرنے کے لیے وہ سب کچھ کہنا اور کرنا شروع کردیں جو نئے تعلیم یافتہ گروہ کی اہواء کے مطابق ہو۔ اب وہ زمانے کے ساتھ چل کر بتارہے ہیں۔ سیاسیات میں طریق اسلامی سے انحراف، فتووں میں مداہنت، تقریروں میں "روشن خیالی" کی نمائش، یہ سب کچھ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ ان میں سے بعض تو بالقصد ایسا کر رہے ہیں، اور بعض کے دل میں مداہنت کا چور گھس چکا ہے، مگر انھیں اس کا شعور نہیں ہے۔

ان حضرات سے قطع نظر کرکے جب ہم ان علماء کو دیکھتے ہیں جو مداہنت کی وبا سے محفوظ ہیں تو ان میں ہم کو دو گروہ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو بینکنگ اور انشورنس کے خلاف اپنے اسی مسلک پر قائم ہے جو ابتدا میں انہوں نے یا ان کے پیشروؤں نے اختیار کیا تھا۔ اور دوسرا گروہ وہ ہے جو مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کو حل کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا ہے، اور اس کے نزدیک حل مشکلات کی صورت بس یہی ہے کہ جس کو خدا نے حرام کیا تھا اسے حلال کرنے کی صورتیں نکالی جائیں یا بالفاظ دیگر حدود شریعت میں رخنے نکالے جائیں تاکہ اتباع شیطان کا چور ان راہوں سے باسانی گھس سکے۔ میں نے ان دونوں گروہوں کی اکثر تحریروں کو دیکھا ہے، اور ان دونوں میں ایک ہی قسم کی کمزوری پائی ہے۔ بالعموم یہ حضرات بینکنگ اور انشورنس کے مسئلے کو، فقہ، یعنی سول لا کے

نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں یہ ایک جزئی معاملہ ہے فرد اور فرد کے درمیان۔ ایک فریق جبکہ یا انشورنس کا کارندہ ہے، اور دوسرا فریق وہ شخص ہے جو اس سے معاملہ کرتا ہے۔ اب وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ فقہاء نے مالی لین دین اور عقود کے بارے میں جو قوانین مرتب کیے ہیں ان کے لحاظ سے فریقین کا باہمی معاملہ کس نوعیت کا ہے۔ جو علماء قانون اور اس کے نفاذ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں وہ اس کو عقد فاسد قرار دیتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں افراد قوم کی مالی مشکلات زیادہ اہمیت رکھتی ہیں وہ قانونِ اضطرار کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، یا پھر مسئلہ دار الحرب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ سے تعرض کرنے کا یہ طریقہ ہی اصولاً غلط ہے۔ بینکنگ اور انشورنس اور مالیات جدیدہ کے دوسرے شعبوں پر سول لا کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ معاشیات کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالنی چاہیے۔ انھیں اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ ایک خاص معاشی نظام کو چلانے والے شعبے ہیں، ایک خاص معاشی پالیسی ہے جس کو یہ عمل میں لاتے ہیں، چند خاص معاشی اصول ہیں جن پر یہ قائم ہیں، اور ایک خاص رخ ہے جس پر یہ دنیا کے معاشی معاملات کو لیے جا رہے ہیں۔ اب اصل تنقیح طلب سوال یہ ہے کہ اسلام اس معاشی نظام اور اس کے اصول و قواعد اور اس کی پالیسی سے موافقت رکھتا ہے یا نہیں، اور اس بات کو گوارا کر سکتا ہے یا نہیں کہ دنیا کے معاشی معاملات اسی رخ پر جائیں جس پر یہ ادارے انھیں لے جا رہے ہیں۔ اگر اسلام ان سے موافقت نہیں رکھتا، اور ان کی رہنمائی کو گوارا نہیں کر سکتا تو مسلمانوں کے لیے اُن سے تعاون کرنا، اور اپنے معاملات کو ان کے ہاتھ میں دینا اصلاً غلط ہوگا۔

پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ ہم ان اداروں کے بعض معاملات کو بعض سے الگ کر کے یہ دیکھیں کہ کونسا جزئیہ ہمارے سول لا کے کس جزئیہ کے موافق یا مخالف ہے۔ اس لیے کہ ان کے تمام جزئی معاملات ایک ہی کل کے اجزاء ہیں اور سب مل کر ایک کلی نظام کی خدمت کر رہے ہیں۔ کلی نظام کی

جو طبیعت ہے وہی اس کے ہر ہر جز کی طبیعت ہے، اور اگر کوئی جز ہمارے سول لا کے مطابق فساد سے پاک بھی ہے، تب بھی وہ بہرحال کلی نظام کے فساد کا تابع ہے۔

مزید براں یہ بھی غلط ہے کہ ہم بنک اور انشورنس وغیرہ اداروں کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات کو شخصی معاملات کی حیثیت سے دیکھیں۔ یہ شخصی معاملہ نہیں بلکہ اجتماعی معاملہ ہے۔ یہ ادارے ایک اجتماعی نظام کے ادارے ہیں۔ اور ہم ایک دوسرے اجتماعی نظام کے افراد ہیں۔ اگر ہم اپنے معاشی معاملات کو ان اداروں کے ہاتھ میں دیدیں اور ان کے اصول و قواعد کے تابع ہو کر اپنا زر ان میں لگائیں اور اپنے کاروبار ان کے ذریعہ سے چلائیں تو اس کا طبعی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ایک معاشی گروہ کی حیثیت سے ان کے اجتماعی نظام میں جذب ہو جائیں گے، اور خود اپنی معاشی پالیسی کو بروئے کار لانے کے بجائے اپنی تمام قوتیں اُس پالیسی کو فروغ دینے میں صرف کرنے لگیں گے جس کو وہ چلا رہے ہیں۔ یہ نتیجہ ایک بڑی حد تک پیدا ہو بھی چکا ہے۔ صرف ایک چیز باقی ہے جس نے ابھی تک مسلمانوں کو بالکلیہ نظام سرمایہ داری میں جذب ہونے سے بچا رکھا ہے، اور وہ سود کی حرمت کا اعتقاد، اور لین دین میں حرام و حلال کی تمیز کا خیال ہے۔ اسی چیز نے اس قوم میں غیر شعوری طور پر اس احساس کو زندہ رکھ چھوڑا ہے کہ ہم سرمایہ داری و اشتراکیت، دونوں سے الگ ایک مستقل معاشی نظام کے پیرو، اور ایک اصلاحی مشن کے علمبردار ہیں۔ اگر اس روک کو اضطرار کے حیلے یا دارالحرب کے بہانے سے دور کر دیا گیا تو پھر یہ رہا سہا احساس بھی فنا ہو جائے گا، اور وہ قوم جو دنیا میں فاسد معاشی نظاموں کو مٹا کر عادلانہ نظام قائم کرنے والی ایک ہی قوم ہے، خود ان فاسد نظاموں میں سے ایک کے اندر جذب ہو کر رہ جائے گی۔

یہی نقطۂ نظر ہے جس سے ہم آئندہ صفحات میں بنکنگ اور انشورنس کے مسائل پر نگاہ ڈالیں گے۔ (باقی)

مطبوعات

اسلام اور موجودہ مدنی مسائل | تالیف مولانا حکیم عبدالرؤف صاحب داناپوری۔ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت ۸ر۔ مجلس دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی۔

جامعہ ملیہ دہلی نے توسیعی خطبات کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں مختلف اسلامی موضوعات پر اکابر علماء کو خطبے پڑھنے کی دعوت دی جاتی ہے یہ خطبہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فاضل خطیب نے اپنی تقریر کے لیے جس قدر اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے اسی قدر خوبی کے ساتھ اس پر بحث بھی کی ہے۔ جدید تہذیب و تمدن نے اسلامی عقائد، عبادات، احکام، اور علوم و فنون کے متعلق جو شبہات پیدا کیے ہیں، قریب قریب ان سب ہی کو وہ زیر بحث لائے ہیں، اور ان پر تنقید کرکے محققانہ طریقہ پر ان کا ایسا حل بیان کیا ہے جو ہر معقول آدمی کو مطمئن کرسکتا ہے۔ اگرچہ پوری تقریر اہم مباحث پر مشتمل ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ وہ حصہ اختصار کے باوجود زیادہ اہم ہے جس میں فاضل موصوف نے سیاست اور معاشیات کے متعلق اسلام اور مغربی تمدن کا موازنہ کیا ہے۔ چونکہ آجکل سب سے زیادہ مغربی سیاست اور معیشت ہی کی چمک نے اہل مشرق کی آنکھوں کو خیرہ کیا ہے، اس لیے ضروری ہوگیا ہے کہ اسی ملمع کو آ سحر اصل حقیقت نمایاں کی جائے۔

تعجب ہے کہ اتنے اہم اور تشریح طلب مسائل کو ایک ہی خطبہ میں جمع کرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔ اگر انہی مضامین کو چار یا پانچ خطبات میں تقسیم کرکے ذرا زیادہ وضاحت کیساتھ بیان کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

صحیفۂ چین | از جناب سید اسد علی صاحب انوری فرید آبادی ضخامت ۲۴۸ صفحات مجلد قیمت عہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

بدرالدین چینی کی کتاب "چینی مسلمان" کے بعد اردو زبان میں یہ دوسری کتاب ہے جو چین کے متعلق زیادہ

وسیع پیمانہ پر معلومات بہم پہونچاتی ہے۔ اس کتاب کا عمود "چین کے حکیم اعظم کنفیوشس کی کتاب "شو کنگ" کے ترجمہ کو قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ تین ضمیمے جو مترجم نے اپنی طرف سے بڑھائے ہیں، وہ شوکنگ کے ترجمہ سے ضخامت میں دوگنے ہیں، اور دراصل عام ناظرین کی واقفیت کے لیے اس سے بہت زیادہ مفید ہیں۔ پہلا ضمیمہ کنفیوشس کی سیرت، اس کی تعلیمات، اور اس کے فلسفے پر ہے۔ دوسرے میں چین کے جغرافیہ، تاریخ، زبان و ادب، مذاہب اور سیاسی و معاشی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرا ضمیمہ شاہان چین کی تاریخ وار فہرست پر مشتمل ہے۔

کنفیوشس کی کتاب سے ایک خاص بات معلوم ہوئی۔ وہ یہ کہ چینی روایات میں بھی طوفان نوح کا ذکر موجود ہے۔ اور دراصل چین کی مسلسل تاریخ ہی طوفان کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔

مضامین رشید | از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات قیمت عہ۔ مکتبہ جامعہ۔ دہلی۔

رشید احمد صاحب ایک ظرافت نگار ادیب کی حیثیت سے ہندوستان میں اس قدر مشہور ہیں کہ ان کے تعارف کی کوشش کرنا ان کی شہرت پر حرف لانا ہے اور اس مجموعہ کی تعریف بس اسقدر کافی ہے کہ یہ انکے چند ظریفانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

واردات | از منشی پریم چند انجہانی ضخامت ۲۰۰ صفحات مجلد قیمت ۵۔ مکتبہ جامعہ دہلی۔

ہندوستان جدید کے مشہور فسانہ نگار پریم چند کی ۱۳ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ زبان کی لطافت و سادگی اور پھر زندگی کے واردات کو فطری انداز بیان میں پیش کرنے کے اعتبار سے پریم چند موجودہ زمانہ کے ہندوستانی افسانہ نگاروں میں سب سے بازی لے گئے تھے اب ان کی وفات کے بعد ان کے یہ ادبی کارنامے پہلے سے زیادہ بیش قیمت ہو گئے ہیں۔

جدید دستور کا خاکہ | از زین العابدین احمد صاحب قیمت ۲ر مکتبۂ جامعہ۔ دہلی۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سیاسی و معاشی مسائل پر جو پروپیگنڈا شروع کیا ہے، یہ رسالہ اس کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں کانگریسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے جدید دستور پر تنقید کی گئی ہے۔

تمدن عرب مصنفہ ڈاکٹر گستاؤلی بان ترجمہ علامہ سید علی بلگرامی مرحوم اور آنریبل نواب جیون یار جنگ بہادر چیف جسٹس عدالت العالیہ کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ دوسری بار شائع ہوئی ہے قیمت (عمعہ) روپیہ علاوہ خرچ ٹپہ۔

تمدن ہند مصنفہ ڈاکٹر گستاؤلی بان ترجمہ علامہ سید علی بلگرامی مرحوم کے بے مثل کارنامہ جس کے اسوقت چند نسخہ باقی رہ گئے ہیں (امید کہ علم دوست حضرات اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے) قیمت صرف (ہےعمہ) روپیہ علاوہ خرچ ٹپہ۔

ابن سعود مولفہ مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ عثمانیہ سلطان ابن سعود کی زندگی کے واقعات کا ایک دلکش اور حیرت کن مرقع جس نے عرب کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک کر از سر نو میدان عمل میں لا کھڑا کیا اس کتاب سے سلطان کی کارگزاریوں اور عرب کے موجودہ حالات کا پتہ چلتا ہے قیمت مجلد (عہ)

مسز حسین مولفہ مولوی فیض محمد صاحب و سید بادشاہ حسین صاحب عہد حاضرہ کی مشہور ترین عورت جس کے حالات زندگی سے ہر فرد بشر واقف ہونے کے لیے بے چین ہے۔ باوثوق ذرائع سے مہیا کر کے اس رومانوی داستان کو مورخانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے قیمت (عمہ) خرچ ٹپہ بذمہ خریدار۔

مشاہیر ہند۔ مولفہ سید بادشاہ حسین صاحب۔ ہندوستان کے چھ مشاہیر آغا خان، اقبال، اکبر حیدری، بوس، ٹیگور، اور جواہرلال کے سبق آموز سوانح حیات انکے علمی و ادبی کارناموں پر تبصرے انکی قوم پرستی کے کارنامے اور انکے پیغامات شرح و بسط کے ساتھ لکھے گئے ہیں ٹائٹل کے دیدہ زیبی کے علاوہ مشاہیر کی عمدہ تصویریں بھی شامل ہیں قیمت مجلد (عمہ)۔

اردو میں ڈرامانگاری مصنفہ سید بادشاہ حسین صاحب فن ڈرامانگاری پر ایک مبسوط تبصرہ ڈراما کی تاریخ اور اسکی تدریجی ترقی کے اسباب و علل اور ان کا تفصیلی خاکہ اردو ڈراما کی ابتداء اسکی نشو و نما ممتاز ڈرامانگاروں کی فنی صلاحیت پر تنقید اور ان کے مشہور ڈراموں پر ایک تبصرہ شامل ہے اس موضوع پر یہ پہلی مکمل کتاب ہے جس کے متعلق متعدد معیاری رسائل و اخبارات میں تعریفی تنقیدیں شائع ہو چکے ہیں صفحات تقریباً ۳۰۰ مجلد قیمت (عہ)

اور حسب ذیل کتب عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہونگے شائقین ادب و علم دوست حضرات انتظار کریں۔

مصطفیٰ کمال پاشاہ آتاترک، رضا شاہ پہلوی، ہر ہٹلر، سنیور مسولینی، ڈیوک آف ونڈسر (ایڈورڈ ہشتم)۔

کتب خانہ ہذا میں

علاوہ درسی کتب کے ہر قسم کے علمی و ادبی کتب بھی موجود ہیں اور آرڈر ملنے پر فراہم کیے جاسکتے ہیں۔

المشتہر

سید عبدالقادر اینڈ سنس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز و پبلشرز چارمینار حیدرآباد دکن

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس